

بیدی

نیا ادارہ

دانہ و دام

راجندر سنگھ بیدی

دانہ و دام

نیا ادارہ ○ لاہور

تیسرا ایڈیشن، گیارہ سو

پرنٹر: حمایت اسلام پریس، لاہور

پبلشر: نذیر چودھری، مالک نیا ادارہ، لاہور

اپنے مرحوم ماں، باپ کے نام

افسانے

پیش لفظ

'دانہ و دام' کی پہلی تقریظ اس جنگ کی ...... وہ عظیم قربانی ہے جو شاید کسی وکٹوریہ کراس کی مرہونِ منت نہیں۔ اس کے لئے میں صاحبِ تقریظ سے اظہارِ افسوس کرتا ہوں اور پڑھنے والوں سے ہمدردی۔

'دانہ و دام' میری پہلی چند کوششوں کا مجموعہ ہے۔ جن میں فنکار قدرے نمایاں ہے۔ ہر افسانہ میں ٹوسٹ (Twists) بالارادہ لائی گئی ہیں۔ پڑھنے والوں کے تجسّس سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ایک فقرہ افسانے کے شروع میں آیا جسے بعد کی لفاظی اور منظر کشی میں عمداً گم کر دیا گیا اور بعد میں اسے دہرا کر نہ صرف ایک توازن قائم کیا گیا بلکہ خیالات کے تسلسل سے پڑھنے والے کے جمالیاتی ذوق کو آسودہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ماحول کی تکرار عیب اور فن کی سرحدوں پر بھٹکتی رہی۔ بارہا شوق کی بات کا یہ عالم ہوا کہ لکھتے لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر

'گرہن' اور اس کے بعد کے افسانوں میں ایسا نہ ہوا۔ بقول میر ؎

خاک میں مل کے تعمیر ہم سمجھے بے ادائی تھی آسماں کی ادا

لیکن بعد کے افسانوں میں اس قسم کا خلوص اور شدتِ تاثر نہ ہوا۔ 'گرم کوٹ' میں مقامِ اوج ایک سے زیادہ سہی لیکن یہ فنی خامی بذاتِ خود کسی فنی خوبی سے کم نہ ہوئی اور کسی نقاد نے کہانی کی عظمت سے انکار نہیں کیا بلکہ اسے فنی طور پر درست کہانیوں پر فوق حاصل ہوا۔ کہانی کا کوئی معین کلیہ نہیں، یہ زمین ہر صاحبِ طبع کا اجارہ ہے جس میں ہر تجربہ کی اجازت ہے۔ کیونکہ اس میں عمل سے زیادہ نتیجہ کو دیکھنا ہوتا ہے۔ کوئی قلم برداشتہ لکھ دیتا ہے۔ کوئی چیخوف کے قول کے مطابق "اس طرح آہستہ آہستہ لکھتا ہے جیسے کہ مریض بھنا ہوا تیتر کھاتا ہے ـــــ ہولے ہولے اور سوچ سوچ کر ـــــ" یعنی اگر حاصلِ عمل درست ہے تو سب کچھ درست ہے۔

بزرگوارم رشید صدیقی صاحب نے اپنے ایک گرامی نامہ میں 'دانہ و دام' کے بعد کی کہانیوں کے متعلق لکھا ـــ "آپ جزو کو کل سے زیادہ دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ یہ آپ کی شخصی فتحمندی ہے لیکن یہاں پہنچ کر ایسا نہ ہو کہ جزو ہی مقصد بن جائے جیسا ہمارے اگلے شعراء کا وطیرہ تھا۔ میں فن کے کمال کا اتنا قائل نہیں جتنا کہ فنکار کے کمال کا...... مثال کے طور پر سمجھ لیجیئے کہ میں شاعری کا اتنا قائل نہیں جتنا کہ غالبؔ یا اقبالؔ کا......"

'دانہ و دام' کے افسانے لکھتے ہوئے مجھے فنی کمال حاصل نہیں تھا لیکن فنکار بدرجۂ اتم زندہ تھا۔ اب جبکہ آہستہ آہستہ فن پر قدرے عبور حاصل ہو رہا ہے تو فنکار رجعت اور جدیت کے درمیان معلق ہے اور اس حیاتیاتی کشمکش کا نتیجہ معلوم؟

۱۵ر جون ۱۹۴۳ء

راجندر سنگھ بیدی

بھولا

میں نے مایا کو پتھر کے ایک کونڈے میں مکھن رکھتے دیکھا۔ چھاچھ کی کھٹاس کو دور کرنے کے لئے مایا نے کونڈے میں پڑے ہوئے مکھن کو کنوئیں کے صاف پانی سے کئی بار دھویا۔ اس طرح مکھن کے جمع کرنے کی کوئی خاص وجہ تھی۔ ایسی بات عموماً مایا کے کسی عزیز کی آمد کا پتہ دیتی تھی۔ ہاں! اب مجھے یاد آیا۔ دو دن کے بعد مایا کا بھائی اپنی بیوہ بہن سے راکھی بندھوانے کے لئے آنے والا تھا۔ یوں تو اکثر بہنیں بھائیوں کے ہاں جا کر انہیں راکھی باندھتی ہیں۔ مگر مایا کا بھائی اپنی بہن اور بھانجے سے ملنے کے لئے خود ہی آجایا کرتا تھا اور راکھی بندھوا لیا کرتا تھا۔ راکھی بندھوا کر وہ اپنی بیوہ بہن کو یہی یقین دلاتا تھا کہ اگرچہ اس کا سہاگ لٹ گیا ہے مگر جب تک اس کا بھائی زندہ ہے اس کی رکھشا، اس کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لیتا ہے۔

ننھے بھولے نے میرے اس خیال کی تصدیق کر دی۔ گنا چوستے ہوئے اس نے کہا:

"بابا! پرسوں ماموں جی آئیں گے نا ——؟"

میں نے اپنے پوتے کو پیار سے گود میں اٹھا لیا۔ بھولے کا جسم بہت نرم و نازک تھا اور اس کی آواز بہت سُریلی تھی۔ جیسے کنول کی پتیوں کی نزاکت اور سپیدی، گلاب کی سُرخی اور بلبل کی خوش الحانی کو اکٹھا کر دیا گیا ہو۔ اگرچہ بھولا میری لمبی اور گھنی داڑھی سے گھبرا کر مجھے اپنا منہ چومنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ تاہم میں نے زبردستی اس کے سُرخ گالوں پر پیار کی مہر ثبت کر دی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا:

"بھولے —— تیرے ماموں جی۔۔۔ تیری ماتا جی کے کیا ہوتے ہیں؟"

بھولے نے کچھ تامل کے بعد جواب دیا "ماموں جی!"

مایا نے استوتر پڑھنا چھوڑ دیا اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ میں اپنی بہو کے اس طرح کھل کر ہنسنے پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ مایا بیوہ تھی اور سماج اسے اچھے کپڑے پہننے اور خوشی کی بات میں حصہ لینے سے بھی روکتی تھی۔ میں نے بارہا مایا کو اچھے کپڑے پہننے، ہنسنے کھیلنے کی تلقین کرتے ہوئے سماج کی پروا نہ کرنے کے لئے کہا تھا۔ مگر مایا نے از خود اپنے آپ کو سماج کے رُوح فرسا احکام کے تابع کر لیا تھا۔ اس نے اپنے تمام اچھے کپڑے اور زیورات کی پٹاری ایک صندوق میں مقفل کر کے چابی ایک جوہڑ میں پھینک دی تھی۔

مایا نے ہنستے ہوئے اپنا پاٹھ جاری رکھا۔

ہری ہر، ہری ہر، ہری ہر، ہری
میری بار کیوں دیر اتنی کری

پھر اس نے اپنے لعل کو پیار سے بُلاتے ہوئے کہا:

"بھولے —— تم نخی کے کیا ہوتے ہیں؟"

"بھائی!" بھولے نے جواب دیا۔

"اسی طرح تیرے ماموں جی میرے بھائی ہیں۔"

بھولا یہ بات نہ سمجھ سکا کہ ایک ہی شخص کس طرح ایک ہی وقت میں کسی کا بھائی اور کسی کا ماموں ہو سکتا ہے۔ وہ تو اب تک یہی سمجھتا آیا تھا کہ اس کے ماموں جان اس کے باباجی کے بھی ماموں جی ہیں۔ بھولے نے اس جھمیلے میں پڑنے کی کوشش نہ کی اور اچک کر ماں کی گود میں جا بیٹھا اور اپنی ماں سے گیتا سُننے کے لئے اصرار کرنے لگا۔ وہ گیتا محض اس وجہ سے سنتا تھا کہ وہ کہانیوں کا شوقین تھا اور گیتا کے ادھیائے کے آخر میں مہاتم سُن کر وہ بہت خوش ہوتا۔ اور پھر جوہڑ کے کنارے اگی ہوئی دوب کی مخملی تلواروں میں بیٹھ کر گھنٹوں ان مہاتموں پر غور کیا کرتا۔

مجھے دوپہر کو اپنے گھر سے چھ میل دور اپنے مزارعوں کو ہل پہنچانے تھے۔ بوڑھا جسم، اس پر مصیبتوں کا مارا ہوا، جوانی کے عالم میں تین تین من بوجھ اٹھا کر دوڑا کیا۔ مگر اب بیس سیر بوجھ کے نیچے گردن پچکنے لگتی ہے۔ بیٹے کی موت نے امید کو یاس میں تبدیل کر کے کمر توڑ دی تھی۔ اب میں بھولے کے سہارے ہی جیتا تھا۔ ورنہ دراصل تو مر چکا تھا۔

رات کو میں تکان کی وجہ سے بستر پر لیٹتے ہی اُونگھنے لگا۔ ذرا توقف کے بعد مایا نے مجھے دودھ پینے کے لئے آواز دی۔ میں اپنی بہو کی سعادت مندی پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا، اور اسے سینکڑوں دعائیں دیتے ہوئے میں نے کہا:

"مجھ بوڑھے کی اتنی پروا نہ کیا کرو بیٹا"

——— بھولا ابھی تک نہ سویا تھا۔ اس نے ایک چھلانگ لگائی اور میرے پیٹ پر چڑھ گیا۔ بولا:

"بابا جی! آپ آج کہانی نہیں سنائیں گے کیا؟"

"نہیں بیٹا" ——— میں نے آسمان پر نکلے ہوئے ستاروں کو دیکھتے ہوئے کہا "میں آج بہت تھک گیا ہوں ——— کل دوپہر کو تمہیں سناؤں گا۔"

بھولے نے روٹھتے ہوئے جواب دیا "میں تمہارا بھولا نہیں بابا۔ میں ماتا جی کا بھولا ہوں۔"

بھولا بھی جانتا تھا کہ میں نے اس کی ایسی بات کبھی برداشت نہیں کی۔ میں ہمیشہ اس سے یہی سننے کا عادی تھا کہ "بھولا بابا جی کا ہے اور ماتا جی کا نہیں۔" مگر اس دن بھولے کو کندھے پر اٹھا کر چھ میل تک لے جانے اور پیدل ہی واپس آنے کی وجہ سے میں بہت تھک گیا تھا۔ شاید میں اتنا نہ تھکتا۔ اگر میرا اپنا جوتا ایڑی کو نہ دباتا۔ اور اس وجہ سے میرے پاؤں میں ٹیسیں نہ اٹھتیں۔ اس غیر معمولی تھکن کے باعث میں نے بھولے کی وہ بات بھی برداشت کی۔ میں آسمان پر ستاروں کو دیکھنے لگا۔ آسمان کے جنوبی گوشے میں ایک ستارہ مشعل کی طرح روشن تھا۔ غور سے دیکھنے پر وہ مدھم سا ہونے لگا ——— میں اونگھتے اونگھتے سو گیا۔

صبح ہوتے ہی میرے دل میں خیال آیا کہ بھولا سوچتا ہوگا کہ کل رات بابا نے میری بات کس طرح برداشت کی؟ میں اس خیال سے لرز گیا کہ بھولے کے دل میں کہیں یہ خیال نہ آیا ہو کہ اب بابا میری پروا نہیں کرتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ صبح کے وقت اس نے میری گود

میں آنے سے انکار کر دیا اور بولا:

"میں نہیں آؤں گا —— تیرے پاس بابا!"

"کیوں بھولے؟"

"بھولا باباجی کا نہیں —— بھلا ماماجی کا ہے۔"

میں نے بھولے کو مٹھائی کے لالچ سے منا لیا اور چند ہی لمحات میں بھلا باباجی کا بن گیا اور میری گود میں آ گیا۔ اور اپنی ننھی ٹانگوں کے گرد میرے جسم سے لپٹے ہوئے کمبل کو لپیٹنے لگا۔ مایا ہری ہر استوتر پڑھ رہی تھی۔ پھر اس نے پاؤ بھر مکھن نکالا اور اسے کوزے میں ڈال کر کنوئیں کے صاف پانی سے چھاچھ کی کھٹاس کو دھو ڈالا۔ اب مایا نے اپنے بھائی کے لئے سیر کے قریب مکھن تیار کر لیا تھا۔ میں بہن بھائی کے اس پیار کے جذبہ پر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ اتنا خوش کہ میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ میں نے دل میں کہا: عورت کا دل محبت کا ایک سمندر ہوتا ہے۔ ماں باپ، بھائی بہن، خاوند بچے، سب سے وہ بہت ہی پیار کرتی ہے اور اتنا کرنے پر بھی وہ ختم نہیں ہوتا۔ ایک دل کے ہوتے ہوئے بھی، وہ سب کو اپنا دل دے دیتی ہے۔ بھولے نے دونوں ہاتھ میرے گالوں کی جھریوں پر رکھے، مایا کی طرف سے چہرے کو ہٹا کر اپنی طرف کر لیا اور بولا:

"بابا تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا ——؟"

"کس بات کا —— بیٹا؟"

"تمہیں آج دوپہر کو مجھے کہانی سنانی ہے۔"

"ہاں بیٹا —— !" میں نے اس کا منہ چومتے ہوئے کہا۔

یہ تو بھولا ہی جانتا ہو گا کہ اس نے دوپہر کے آنے کا کتنا انتظار کیا۔ بھولے کو اس بات کا علم تھا کہ باباجی کے کہانی سنانے کا وقت وہی ہوتا ہے جب وہ کھانا کھا کر اس پلنگ پر جا لیٹتے ہیں جس پر وہ باباجی یا ماتا جی کی مدد کے بغیر نہیں چڑھ سکتا۔ چنانچہ وقت سے آدھ گھنٹہ پیشتر ہی اس نے کھانا نکلوانے پر اصرار شروع کر دیا۔ میرے کھانے کے لئے نہیں بلکہ اپنے کہانی سننے کے چاؤ سے۔

میں نے معمول سے آدھ گھنٹہ پہلے کھانا کھایا۔ ابھی آخری نوالہ میں نے توڑا ہی تھا کہ پٹواری نے دروازے پر دستک دی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہلکی سی جریب تھی۔ اس نے کہا کہ خانقاہ والے کنوئیں پر آپ کی زمین کو ناپنے کے لئے مجھے آج ہی فرصت مل سکی ہے، پھر نہیں۔

دالان کی طرف نظر دوڑائی تو میں نے دیکھا، بھولا چارپائی کے چاروں طرف گھوم کر بستر بچھا رہا تھا۔ بستر بچھانے کے بعد اس نے ایک بڑا سا تکیہ بھی ایک طرف رکھ دیا اور خود پائینتی میں پاؤں اڑا کر چارپائی پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اگرچہ بھولے کا مجھے اصرار سے جلد روٹی کھلانا اور بستر بچھا کر میری تواضع کرنا اپنی خود غرضی پر مبنی تھا تاہم میرے خیال میں آیا ——

"آخر بابا کا بیٹا ہی ہے نا —— ایشور اس کی عمر دراز کرے۔"

میں نے پٹواری سے کہا کہ تم خانقاہ والے کنوئیں کو چلو اور میں تمہارے پیچھے پیچھے آ جاؤں گا۔ جب بھولے نے دیکھا کہ میں باہر جانے کے لئے تیار ہوں تو اس کا چہرہ اس طرح مدھم پڑ گیا جس طرح گذشتہ شب کو آسمان کے ہاتھ گننے میں مشعل کی مانند روشن ستارہ مسلسل دیکھتے رہنے کی وجہ سے ماند پڑ گیا تھا۔ بابا نے کہا:

" بابا جی اتنی بھی کیا جلدی ہے؟ ——— خانقاہ والا کنواں کہیں بھاگا تو نہیں جاتا ——— آپ کم سے کم آرام تو کر لیں۔"

" اوں ہوں" میں نے زیرِ لب کہا " پٹواری چلا گیا تو پھر یہ کام ایک ماہ سے اِدھر نہ ہو سکے گا۔"

بابا خاموش ہو گئی۔ بھولا منہ بسورنے لگا۔ اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ اس نے کہا " بابا میری کہانی ——— میری کہانی ———"

" بھولے ——— میرے بچے" میں نے بھولے کو ٹالتے ہوئے کہا " دن کو کہانی سُنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں"

" راستہ بھول جاتے ہیں؟" بھولے نے سوچتے ہوئے کہا " بابا تم جھوٹ بولتے ہو ——— میں بابا جی کا بھولا نہیں بنتا"

اب جبکہ میں تھکا ہوا بھی نہیں تھا اور پندرہ بیس منٹ استراحت کے لئے نکال سکتا تھا۔ بھلا بھولے کی اس بات کو آسانی سے کس طرح برداشت کر لیتا۔ میں نے اپنے شانے سے چادر اتار کر چارپائی کی پائنتی پر رکھی اور اپنی دُکھتی ہوئی ایڑی کو جُوتی کی قید با مشقت سے نجات دلاتے ہوئے پلنگ پر لیٹ گیا۔ بھولا پھر اپنے بابا کا بن گیا۔ لیٹتے ہوئے میں نے بھولے سے کہا :

" اب کوئی مسافر راستہ کھو بیٹھے ——— تو اس کے تم ذمہ دار ہو!"

——— اور میں نے بھولے کو دوپہر کے وقت سات شہزادوں اور سات شہزادیوں کی ایک لمبی کہانی سُنائی۔ کہانی میں ان کی باہمی شادی کو میں نے معمول سے زیادہ دل کش انداز میں بیان کیا۔ بھولا ہمیشہ اس کہانی کو پسند کرتا تھا۔ جس کے آخر میں شہزادہ اور

شہزادی کی شادی ہو جائے۔ مگر میں نے اس روز بھولے کے منہ پر خوشی کی کوئی علامت نہ دیکھی بلکہ وہ ایک افسردہ سا منہ بنائے خفیف طور پر کانپتا رہا۔

اس خیال سے کہ پٹواری خانقاہ والے کنوئیں پر انتظار کرتے کرتے تھک کر اپنی ہلکی ہلکی جھنکار پیدا کرنے والی جریب جیب میں ڈال کر کہیں اپنے گاؤں کا رُخ نہ کر لے میں جلدی جلدی مگر اپنے نئے جوتے میں دبتی ہوئی ایڑی کی وجہ سے لنگڑاتا ہوا بھاگا۔ گو مایا نے جوتی کو سرسوں کا تیل لگا دیا تھا۔ تاہم وہ نرم مطلق نہ ہوئی تھی۔

شام کو جب میں واپس آیا تو میں نے بھولے کو خوشی سے دالان سے صحن میں اور صحن سے دالان میں کودتے پھاندتے دیکھا۔ وہ لکڑی کے ایک ڈنڈے کو گھوڑا بنا کر اسے بھگا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"چل ماموں جی کے دیس ——— رے گھوڑے، ماموں جی کے دیس۔
ماموں جی کے دیس، ہاں ہاں! ماموں جی کے دیس۔ گھوڑے ......"

جونہی میں نے دہلیز میں قدم رکھا۔ بھولے نے اپنا گانا ختم کر دیا اور بولا:

"بابا ——— آج ماموں جان آئیں گے نا ——— ؟"

"پھر کیا ہو گا بھولے ——— ؟" میں نے پوچھا

"ماموں جی اگن بوٹ لائیں گے۔ ماموں جی کلو (کتا) لائیں گے۔ ماموں جی کے سر پہ مکئی کے بھٹوں کا ڈھیر ہو گا نا بابا ——— ہمارے یہاں تو مکی ہوتی ہی نہیں بابا۔ اور تو اور .... ایسی مٹھائی لائیں گے جو آپ نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہو گی۔"

میں حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ کس خوبی سے "خواب میں بھی نہ دیکھی ہو گی" کے الفاظ

سات شہزادوں اور سات شہزادیوں والی کہانی کے بیان میں سے اس لئے یاد رکھے تھے

"جیتا رہے" میں نے دعا دیتے ہوئے کہا" بہت ذہین لڑکا ہوگا اور ہمارے نام کو روشن کرے گا۔"

شام ہوتے ہی بھولا دروازے میں جا بیٹھا تاکہ ماموں جی کی شکل دیکھتے ہی اندر کی طرف دوڑے اور پہلے پہل اپنی ماتا جی کو اور پھر مجھے اپنے ماموں جی کے آنے کی خبر سنائے۔

دیئوں کو دیا سلائی دکھائی گئی۔ جوں جوں رات کا اندھیرا گہرا ہوتا جاتا، دیئوں کی روشنی زیادہ ہوتی جاتی۔ متفکرانہ لہجہ میں مایا نے کہا:

"بابا جی ——— بھیا ابھی تک نہیں آئے"

"کسی کام کی وجہ سے ٹھہر گئے ہوں گے۔"

"ممکن ہے کوئی ضروری کام آپڑا ہو ——— راکھی کے روپے ڈاک میں بھیج دیں گے ———"

"مگر راکھی؟"

"ہاں راکھی کی کہو...... انہیں اب تک تو آجانا چاہئے تھا۔"

میں نے بھولے کو زبردستی دروازے کی دہلیز پر سے اٹھایا۔ بھولے نے اپنی ماتا سے بھی زیادہ متفکرانہ لہجہ میں کہا: " ماتا جی ——— ماموں جی کیوں نہیں آئے؟"

مایا نے بھولے کو گود میں اٹھاتے ہوئے اور پیار کرتے ہوئے کہا:" شاید صبح کو آجائیں ——— تیرے ماموں جی ——— میرے بھولے!"

پھر بھولے نے اپنے نرم و نازک بازوؤں کو اپنی ماں کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا،

"میرے ماموں جی تمہارے کیا ہوتے ہیں؟"

"سمجھو تم ننھی کے ہو"

"بھائی؟"

"تم جانو ——"

"اور ننھی (بھولے کا دوست) کے کیا ہوتے ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں ——"

"بھائی بھی نہیں؟"

"نہیں ——"

—— اور بھولا اس عجیب بات کو سوچتا ہوا سو گیا۔ جب میں اپنے بستر پر لیٹا تو پھر وہ مشعل کی مانند چمکتا ہوا ستارہ آسمان کے ایک کونے میں میرے گھورنے کی وجہ سے ماند ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے پھر بھولے کا چہرہ یاد آ گیا جو میرے خانقاہ والے کنوئیں کو جانے پر تیار ہونے کی وجہ سے یوں ہی ماند پڑ گیا تھا۔ کتنا شوق ہے بھولے کو کہانیاں سننے کا۔ وہ اپنی ماں کو استوتر بھی پڑھنے نہیں دیتا۔ اتنا بچہ بھلا گیتا کو کیا سمجھے۔ مگر صرف اس وجہ سے کہ اس کے ادھیائے کا مہاتم ایک دلچسپ کہانی ہوتا ہے۔ وہ نہایت صبر سے ادھیائے کے ختم ہونے اور مہاتم کے شروع ہونے کا انتظار کیا کرتا ہے۔

"تایا کا بھائی ابھی تک نہیں آیا۔ شاید نہ آئے"۔ میں نے دل میں کہا۔ "اسے اپنی بہن کا پیار سے جمع کیا ہوا مکھن کھانے کے لئے تو آ جانا چاہئے تھا"۔ میں ستاروں کی طرف دیکھتے دیکھتے اونگھنے لگا۔ یکایک مایا کی آواز سے میری نیند کھلی۔

وہ دُودھ کا کٹورا لئے کھڑی تھی۔

"میں نے کتنی بار کہا ہے ——— تم میرے لئے اتنی تکلیف نہ کیا کرو ——" میں نے کہا۔

دودھ پینے کے بعد فرطِ شفقت سے میرے آنسو نکل آئے۔ حد سے زیادہ خوش ہو کر میں مایا کو یہی دُعا دے سکتا تھا کہ وہ سہاگ وتی رہے۔ کچھ ایسا ہی میں نے کہنا چاہا مگر اس خیال کے آنے سے کہ اس کا سہاگ تو برس ہوئے لُٹ گیا تھا میں نے کچھ نہ کچھ کہنے کی غرض سے اپنی رقّت کو دباتے ہوئے کہا:

"بیٹی ——— تمہیں اس سیوا کا پھل ملے بغیر نہ رہے گا۔"

پھر میرے پہلو میں بچھی ہوئی چارپائی پر سے بھولا نیمی کو جو کہ اس کے ساتھ ہی سو رہی تھی، پرے دھکیلتے ہوئے اور آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھا۔ اُٹھتے ہی اس نے کہا:

"بابا ——— ماموں جی ابھی تک کیوں نہیں آئے؟"

"آ جائیں گے ——— بیٹا۔ سو جاؤ۔ وہ صبح سویرے آ جائیں گے۔"

اپنے بیٹے کو اپنے ماموں کے لئے اس قدر بیتاب دیکھ کر مایا بھی کچھ بیتاب سی ہو گئی۔ عین اس طرح جس طرح ایک شمع سے دوسری شمع روشن ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ بھولے کو لٹا کر تھپکنے لگی۔

مایا کی آنکھوں میں بھی نیند آنے لگی۔ یوں بھی جوانی میں نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور پھر دن بھر کام کاج کر کے تھک جانے کی وجہ سے مایا گہری نیند سوتی تھی۔ میری نیند تو عام بُڈھوں کی سی نیند تھی۔ کبھی ایک آدھ گھنٹہ تک سو لیتا۔ پھر دو گھنٹے جاگتا رہتا۔ پھر کچھ دیر اُونگھنے

لگ جاتا اور پوری رات اختر شماری کرتے گزار دیتا۔ میں نے بابا کو سو جانے کے لئے کہا اور بھولے کو اپنے پاس لٹا لیا۔

"بتی جلتی رہنے دو۔ صرف دھیمی کر دو —— میلے کی وجہ سے بہت سے چور چکار ادھر ادھر گھوم رہے ہیں" —— میں نے سوئی ہوئی بابا سے کہا۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس دفعہ میلہ پر جو لوگ آئے تھے ان میں ایسے آدمی بھی تھے جو کہ ننھے ننھے بچوں کو اغوا کر کے لے جاتے تھے۔ پڑوس کے ایک گاؤں میں دو ایک ایسی وارداتیں ہو چکی تھیں اور اسی لئے میں نے بھولے کو اپنے پاس لٹا لیا تھا۔ میں نے دیکھا۔ بھولا جاگ رہا تھا۔ اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب میری آنکھ کھلی تو میں نے بتی کو دیوار پر نہ دیکھا۔ گھبرا کر ہاتھ لپکایا تو میں نے دیکھا کہ بھولا بھی بستر پر نہ تھا۔ میں نے اندھوں کی طرح در و دیوار سے ٹکراتے اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے تمام چارپائیوں پر دیکھا۔ بابا کو بھی جگایا۔ گھر کا کونہ کونہ چھانا۔ بھولا کہیں نہ تھا ——!

"بابا —— ہم لٹ گئے!" میں نے اپنا سر پیٹتے ہوئے کہا۔

بابا ماں تھی۔ اس کا کلیجہ جس طرح شق ہوا یہ کوئی اسی سے پوچھے۔ اپنے سہاگ لٹنے پر اس نے اتنے بال نہ نوچے تھے جتنے کہ اس وقت نوچے۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح چیخیں مار رہی تھی۔ پاس پڑوس کی عورتیں شور سن کر جمع ہو گئیں اور بھولے کی گمشدگی کی خبر سن کر رونے پیٹنے لگیں۔

میں عورتوں سے زیادہ پیٹ رہا تھا۔ آج میں نے ایک بازی گر کو اپنے گھر کے اندر

گُمّہ نے بھی دیکھا تھا۔ مگر میں نے پروا نہیں کی تھی۔ آہ! وہ وقت کہاں سے ہاتھ آئے جبھی نے دعائیں کہیں کہ کسی وقت کا دیا کام آجائے۔ سُنتی ہیں مائیں کہ بھولا مل جائے۔ وہی اندھیرے گھر کا اُجالا تھا۔ اسی کے دم سے میں اور مایا جیتے تھے۔ اسی کی آس سے ہم اُڑتے پھرتے تھے۔ وہی ہماری آنکھوں کی بینائی، وہی ہمارے جسم کی توانائی تھا۔ اس کے بغیر ہم کچھ نہ تھے۔

میں نے گھوم کر دیکھا۔ مایا بے ہوش ہوگئی تھی۔ اس کے ہاتھ اندر کی طرف مُڑ گئے تھے۔ نسیں کھچی ہوئی اور آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں اور عورتیں اس کی ناک بند کر کے ایک چمچے سے اس کے دانت کھولنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

میں سچ کہتا ہوں۔ ایک لمحہ کے لئے میں جوگے کو بھی بھول گیا۔ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ایک ساتھ گھر کے دو بشر جب دیکھتے دیکھتے ہاتھوں سے چلے جائیں تو اس وقت دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے لرزتے ہوئے ایشور کو بُرا بھلا کہا کہ اگر ان دکھوں کے دیکھنے سے پیشتر اس نے میری ہی جان کیوں نہ لے لی۔ آہ! مگر جس کی قضا آتی ہے اس کے سوا کسی اور کا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔

قریب تھا کہ میں بھی مایا کی طرح گر پڑوں کہ مایا ہوش میں آگئی۔ مجھے پہلے سے کچھ سہارا ملا۔ میں نے دل میں کہا: میں ہی مایا کو سہارا دے سکتا ہوں۔ اور اگر میں خود اس طرح حوصلہ چھوڑ دوں تو مایا کسی طرح نہیں بچ سکتی۔ میں نے حواس جمع کرتے ہوئے کہا:

”مایا بیٹی ——— دیکھو! مجھے یوں خانہ خراب مت کرو ——— حوصلہ کرو۔ بچے اغوا ہوتے ہیں مگر آخر مل بھی جاتے ہیں۔ بازیگر بچوں کو مارنے کے لئے نہیں لے

جاتے۔ پال کر بڑا کر کے کسی کام میں لانے کے لئے لے جاتے ہیں ۔۔۔۔ بھولا مل جائے گا۔"

ماں کے لئے یہ الفاظ بے معنی تھے۔ مجھے بھی اپنے اس طرح صبر کرنے پر گمان ہوا۔ گویا میں اس وجہ سے چپ ہو گیا ہوں کہ مجھے بابا کے مقابلہ میں بھولے سے بہت کم پیار ہے۔ مگر "نہیں" ۔۔۔۔ میں نے کہا "آدمی کو ضرور کچھ حوصلہ دکھانا چاہیے۔"

اس وقت آدھی رات ادھر تھی اور آدھی اُدھر جب ہمارا پڑوسی اس حادثہ کی خبر تھانے میں پہنچانے کے لئے جو گاؤں سے دس کوس دُور شہر میں تھا، روانہ ہوا۔

باقی ہم سب ہاتھ ملتے ہوئے صبح کا انتظار کرنے لگے۔ تاکہ دن نکلنے پر کچھ سجھائی دے۔

دفعتاً دروازہ کھلا اور ہم نے بھولے کے ماموں کو اندر آتے دیکھا۔ اس کی گود میں بھولا تھا۔ اس کے سر پر مٹھائی کی ٹوکریاں اور ایک ہاتھ میں بتی تھی۔ ہمیں تو گویا تمام دنیا کی دولت مل گئی۔ مایا نے بھائی کو پانی پوچھا نہ خیریت اور اس کی گود سے بھولے کو چھین کر اسے چومنے لگی۔ تمام اڑوس پڑوس نے مبارک باد دی۔ بھولے کے ماموں نے کہا:

"مجھے کسی کام کی وجہ سے دیر ہو گئی تھی۔ دیر سے روانہ ہونے پر شب کی تاریکی میں میں اپنا راستہ گم کر بیٹھا تھا۔ یکایک مجھے ایک جانب سے روشنی آتی دکھائی دی۔ میں اس کی جانب بڑھا۔ اس خوفناک "بگی" پر سے پوری سے آنے والی لڑک پر بھولے کو بتی پکڑے ہوئے اور کانٹوں میں اُلجھے ہوئے دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ میں نے

اس کے اس وقت وہاں ہونے کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا ——— کہ بابا جی نے آج دوپہر کے وقت مجھے کہانی سُنائی تھی - اور کہا تھا کہ دن کے وقت کہانی سُنانے سے مسافر راستہ بھُول جاتے ہیں۔ تم دیر تک نہ آئے تو میں نے یہی جانا کہ تم راستہ بھُول گئے ہو گے اور بابا نے کہا تھا کہ اگر کوئی مسافر راستہ بھُول گیا تو تم ذمہ دار ہو گے نا ———!!"

ہمدوش

سطحی نظر سے تو یہی دکھائی دیتا ہے کہ مرکزی شفاخانے کے ان لوگوں کو جن کی نگرانی میں بہت سے ناامید و پُرامید مریض رہتے ہیں، مساوات پر بہت یقین ہے۔ وہ ہر چھوٹے بڑے کو بلا امتیازِ مذہب و ملت تیس تیس گرہ کے کھلے پائنچوں کا پاجامہ اور کھلے کھلے بازوؤں والی قمیصیں پہنا دیتے ہیں۔ جن سے ایک خاص قسم کی سوندھی سوندھی نامانوس سی بُو آتی ہے۔ قمیصیں گھٹنے سے کچھ گرہ اونچی ہوتی ہے۔ بعض وقت اتنی اونچی کہ ازاربند بھی دکھائی دینے لگتا ہے۔ مرکزی شفاخانے اور مرکزی زندان خانے کے مکینوں کی پوشش میں فرق ہی کیا ہے؟ یہی نا کہ شفاخانے کے مکینوں کی پوشش قدرے مٹیالی رنگت کی مگر اُجلی ہوتی ہے۔ لیکن زندان خانے میں بسنے والے بدنصیبوں کو شاید ہی کبھی دھوبی کا منہ دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔

شفاخانے میں ان تیس تیس گرہ کے کھلے پائنچوں اور ڈھیلی ڈھالی قمیصوں میں ڈھکے ہوئے بدن بھی ایک ہی ساخت کے ہوتے ہیں جسمانی لحاظ سے کوئی قد سے فربہ یا کوئی بہت لاغر ہو تو ہو لیکن منہ پر ایک ہی سی زردی چھائی ہوتی ہے۔ ایک ہی خوف یا اندیشہ ہوتا ہے جو ہر ایک کے دل میں اضطراب پیدا کیا کرتا ہے۔

"کیا ہم موت کے اس غار سے زندہ سلامت گذر جائیں گے؟"

—— اور یہی سوچ ان غریبوں پر راتوں کی نیند حرام کر دیتی ہے۔

سورج ڈوبنے کو ہے۔ شفاخانے کے احاطے کی مرمت طلب دیوار پر ممولے کی مادہ اپنے انڈوں کے خول بنانے کے لئے چونا کریدنے آتی ہے اور اسی وقت انہی تیس تیس گرہ کے کھلے پائنچوں اور ڈھیلی ڈھالی قمیصوں میں بے رنگ و روپ چہروں والے لوگ حکم امتناعی کے باوجود شفاخانے کے احاطے کی مرمت طلب دیوار پر زندہ ستی کا نظارہ کرنے آتے ہیں اور گھنٹوں حسرت کے عالم میں اس متحرک زندگی کا تماشا کرتے ہیں۔

شفاخانے کے سامنے ایک بساطی کی دوکان پر چند نوجوان لڑکیوں کا جمگھٹا ہے ان کی رنگا رنگ ساڑھیوں کے پلّے بے باکانہ طور پر سر سے اُڑ رہے ہیں۔ کوئی 'ہمانی' کی خریدار ہے، کوئی 'زینت' کی اور کوئی 'کوٹی' کی .... دوکان کے اُوپر، چھت پر پروفیسر کی بیوی چق کے پیچھے اپنے لبوں پر سے لپ سٹک کی اُڑی ہوئی سُرخی کو درست کرتی ہوئی دھندلی سی دکھائی دیتی ہے۔

میرا ساتھی عظیم الدین کھیڑا مغلی —— کھیڑا مغل کا رہنے والا ہے۔ مغلی، پروفیسر کی حسین بیوی کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے اپنے کار بنکل بلکہ وجود تک کے احساس سے

بے نیاز ہو کر کہتا ہے:

"کیا اس کے لبوں پر سے سُرخی اڑ گئی تھی؟"

"دیکھتے نہیں...... ابھی پروفیسر کے کمرے سے باہر آ رہی ہے..... اور....."

"ہش ش.... ہش ش ___ اور ہمارا دوسرا ساتھی اشچرج لال پھر ہمیں فنا کے عالم میں لے آتا ہے۔

سڑک پر ایک سبز اوپل کار پورے زور سے ہارن بجاتی ہوئی گذرتی ہے۔ اس میں بیٹھے ہوئے دو بوڑھوں کی نگاہیں تانگہ میں جاتی ہوئی دلہن کی سُرخ چوڑیوں میں پیوست ہیں اور دلہن کی نگاہیں سڑک کے کنارے پر پڑے ہوئے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر جم رہی ہیں۔

چند ایک اوباش چھوکرے اپنے مخصوص بے پرواہانہ انداز سے ٹپے گاتے ہوئے مینا کی طرف لپکے جا رہے ہیں اور ان سے کچھ ہٹ کر سنبھل سنبھل کر چلتے ہوئے ایک سادھو مہاتما ہیں۔ جن کا ایک ایک قدم شانتی کے تجسس میں اُٹھتا ہے وہ شانتی اور سکون جو کہیں نہیں ملتا...... شفاخانے کے پھاٹک پر دو خوانچے والے گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ وہ دونوں بیک ساعت دروازے کے عین بغل میں اپنا خوانچہ رکھنا چاہتے ہیں.... کمزور نے پیچھے ہٹ کر تنومند کو ایک پتھر مارا ہے....

"ارے او بے صبر و قناعت لوگو! صحت کی اس تھوڑی سی خوشی سے جو تمہیں عاریتاً دی گئی ہے کیوں مستفیض نہیں ہوتے؟ اسے دیکھتے نہیں۔ ہم تمہارے بھائی کتنے حرماں نصیب ہیں؟"

"ہاں بھائی! ___ یہ سب تندرستی کی باتیں ہیں۔" اشچرج لال کہتا ہے۔

"شاید ہم بھی تندرست ہو کر ایسا ہی کریں۔"

پھر یکبارگی مغلی اس قبرستان کی طرف جو شفاخانے کے قریب واقع ہے، دیکھ کر چونک اٹھتا ہے اور کہتا ہے......

"کل ہمارے ہی کمرے میں..... ساتویں چارپائی..... اف! میرا سر گھوم رہا ہے۔ مجھے یوں دکھائی دیتا ہے جیسے وہ قبرستان ہماری طرف آ رہا ہے....."

"ش.... ش ش...." میں اسے خاموش ہو جانے کے لئے کہتا ہوں "ایسی بات نہ کہو بھائی۔"

لیکن مغلی کے بس کی بات نہیں۔ وہ زور سے چھینکتا ہے۔ کار بنکل کے ساتھ اسے انفلوئینزا نے بھی آ دبایا ہے۔ اس کے بالکل زرد، بے رونق چہرے پر سرخ لکدار رقیق لعاب سے بھری ہوئی ناک ایک عجیب اکر یہہ منظر پیدا کر رہی ہے۔

لیکن پھر بھی ہمیں تندرستی کی دلچسپ حماقتیں محو کر ہی لیتی ہیں۔ حتےٰ کہ پھر مغلی ایک خوفناک انداز سے چھینکتا ہے اور بہت سے آبی، لعابی ذرات دھوپ کی گرم رَو میں اڑنے لگتے ہیں۔ چھینکنے سے مغلی کی ریڑھ کی ہڈی پر زور پڑتا ہے اور وہ درد کے ایک شدید احساس سے کار بنکل پر ہاتھ رکھ لیتا ہے۔ جوں جوں درد کم ہوتا ہے اس کی مڑی ہوئی آنکھیں اور ہمارے رکے ہوئے سانس آہستہ آہستہ واپس آتے ہیں۔ کچھ دم لینے کے بعد مغلی کہتا ہے:

"بھائی... کیا ہم ان چوڑے والیوں، ان گوانچہ والوں... مزدوروں کے ہمدوش چل سکیں گے؟"

"تم جی میلا نہ کرو مغلی۔ ہیں... میرا خیال ہے کہ تم بالکل تندرست ہو جاؤ گے

انجرج لال پہلے ہی رو بصحت ہے لیکن میں ان لوگوں کے شانہ بشانہ کبھی نہیں چل سکوں گا، دیکھتے نہیں میری ٹانگ کو؟ بالکل گل ہی تو گئی ہے..... کاش! میں اس گداگر کے دوش بدوش چل سکوں مغلی..... مجھے اس بات کی پروا نہیں۔ چاہے اس کی طرح میری بھی ایک ٹانگ کاٹ لی جائے..... میں فقط یہ چاہتا ہوں کہ صحت کی حالت میں اس احاطہ کی دیوار کو پھاند سکوں.....“

——اور یوں ان تندرست انسانوں کے ہمدوش چلنے کی ایک زبردست خواہش کو پالتے ہوئے ہم اپنے اپنے کمروں کا رُخ کرتے ہیں اور ممولے کی مادہ جو کہ مٹی کے ایک ڈھیر پر بیٹھی ہمارے چلے جانے کا بڑی ہی بے صبری سے انتظار کر رہی تھی۔ پھر اسی مرمت طلب دیوار پر اپنے انڈوں کے خول بنانے کے لئے چونا کریدنے آتی ہے۔

جب پرندہ پرواز کے لئے پر تولتا ہے اور پنجے کا پچھلا حصہ زمین پر سے اٹھا کر نشست و پرواز کی درمیانی حالت میں ہوتا ہے۔ اسے صورتِ ناہض کہتے ہیں۔ بیمار کے لئے صورتِ ناہض بیٹھنا معیوب اور بدشگونی کی علامت گنا جاتا ہے۔ ہاں! جو اس دنیا میں سے ایڑیاں اُٹھا کر فضائے عدم میں پرواز کرنا چاہے، وہ بیمار بلا خوف صورتِ ناہض بیٹھے۔

کیبرا مغلی اسی طرح بیٹھا تھا۔ میں نے اسے یوں بیٹھنے سے منع کیا۔ اور ہمیں دروازہ سے ”گرٹی“ آتے دکھائی دی۔

گرٹی ہماری نرس تھی۔ اس کا پورا نام مس گرٹروڈ بینسن MISS GERTRUDE BENSON تھا مگر ہم میں سے چند ایک دیرینہ مریض اس سے اتنے مانوس ہو گئے تھے کہ اسے اس کے عیسائی نام سے بلانے سے ذرہ بھر بھی تامل نہیں کرتے تھے اور یہ چھوٹی سی رعایت

گرٹی نے خود دے رکھی تھی، وہ مجھ پر عموماً اور کچھ مغلی پر خصوصاً مہربان تھی۔ مغلی کی اُجڈ گنوار حرکتیں گرٹی کے لئے باعثِ تفریح تھیں۔ سُرخ کمبل کو ایک طرف سرکاتے ہوئے وہ اکثر مغلی کے پاس بیٹھ جاتی اور اس کے جھلمی تراش کے بالوں میں اپنی خوبصورت انگلیاں پھیرا کرتی۔

جتنا وہ مغلی کو پیار کرتی اتنا ہی اسے وہم ہو جاتا کہ وہ سلامتی سے بعید ہے۔ وہ کہتا:

”وہ محض میری دلجوئی کے لئے مجھ سے پیار کرتی ہے ...... مریض کو ہر ممکن طریقے سے خوش رکھنا ان کے پیشے کی خصوصیت ہے اور پھر گرٹی میں جذبۂ رحم بھی تو بہت ہے۔ وہ جانتی ہے کہ میرے دن بہت قریب ہیں اور پھر اس چہرے پر رُوکھا پھیکا تبسم بھی رقص نہ کرے گا۔“

”گرٹی!...... گرٹی......“ ہم دونوں نے پکارا

شفاخانے میں چند ایک مریض ایسے بھی تھے جنہیں کھانا گھر سے منگوا لینے کی اجازت تھی۔ ہم ان خوش نصیبوں میں سے نہیں تھے۔ ہمیں شفاخانے کی طرف سے بیماروں کی خاص خوراک ملتی تھی۔ ...... وہ خوش نصیب جب کھانا کھا کر چینی کے برتن دور رکھ دیتے اور ان میں سالن کی زردی اور روغن کی چکناہٹ دکھائی دیتی تو ہمارا دل ہمیں بغاوت کے لئے اُکساتا۔

گرٹی کے ہاتھ سے ہم نے کھانا چھینا۔ وہی روزمرہ کا کھانا۔ اگر بھوک نہ ہوتی تو اس کے کھانے سے ہمیں رتی بھر بھی رغبت نہیں رہی تھی۔ بہت سے دُودھ میں تھوڑا سا ساگودانہ تیرتا ہوا یوں دکھائی دیتا جیسے برسات کے پانی میں مینڈک کے سینکڑوں انڈے چھوٹے چھوٹے سیاہ داغوں کی صورت میں ایک جھلی میں لپٹے ہوئے تیرتے نظر آتے ہیں۔

ہم نے قحط زدہ لوگوں کے مخصوص انداز سے ایک ہی رکابی میں کھانا شروع کر دیا اور گنتی کے کہے کی مطلق پروانہ کی۔ مریضوں کی تیمارداری کے لئے آئے ہوئے لوگ ہمیں گھورنے لگے۔

"ایک سکھ اور ایک مسلمان..... ساتھ ساتھ نہیں، ایک ہی رکابی میں!"

—— وہ کیا جانیں کہ شفاخانے کے احاطے کی چار دیواری سے باہر سب کچھ ہے مگر یہاں کوئی ہندو ہے نہ مسلمان، سکھ ہے نہ عیسائی، گوڑ برہمن اور نہ اچھوت...... یہاں ایک ہی مذہب کے آدمی ہیں جنہیں بیمار کہتے ہیں اور جن کی نجات شفا ہے، جس کے حصول کے لئے وہ اپنی تمام خواہشات اور رہی سہی قوت صرف کر ڈالتے ہیں۔

اس دن شام کو ہم نے پھر تندرست انسانوں کی دلچسپ حماقتوں کا تماشا کیا۔ وہی ہنگامے، وہی بے صبری...... سامنے ایک ڈبل فلائی راؤٹی خیمہ کے نیچے چند ایک آدمی دعوت اُڑا رہے تھے۔ ایک کونے میں چند بوتلیں کھلی پڑی تھیں۔ کبھی کبھی سوڈے کی 'بز' کی آواز آتی...... وہ لوگ ہنستے تھے، چلاتے تھے۔ کیلے اور سنگتروں کے چھلکے ایک دوسرے پر پھینک کر نشانہ بازی کی مشق کرتے تھے اور اس دعوت کی تمام رونق قبرستان کے بے رونق پس منظر کی وجہ سے زیادہ بارونق دکھائی دے رہی تھی، بیشک! زندگی کی بہت سی خوشیاں موت کے پس منظر کی رہین منت ہیں۔ جس طرح اخترِ شب کی درخشندگی رات کی سیاہی اور آسمان کے نیلے پن کی۔

کھیڑا مغلی نے یک بیک صورت ناہض سے اُٹھ کر ایک کانپتا ہوا پرجوش ہاتھ میرے شانہ پر رکھا اور مشکوک انداز سے بولا:

"بھائی...... کیا ہم ان لوگوں کے ہمدوش بھی ہو سکیں گے؟"

میں کچھ دیر مبہوت کھڑا آسمان پر اُڑتی ہوئی چنڈولوں کو دیکھتا رہا۔ پھر میں نے مغلی سے لپٹتے ہوئے کہا: "ہاں...... مغلی کیوں نہیں؛ لیکن تم اس طرح مت ہٹا کرو"

پھر کچھ رُک رُک کر میں نے کہا:

"کل میری ٹانگ کا اپریشن ہے...... گرٹی نے مجھے بتایا تھا۔ شاید آج یہ میری اور تمہاری آخری ملاقات ہو۔ تم ان لوگوں کے دوش بدوش نہ چل سکو گے.... اسٹیرنج بھی شفا پا جائے گا..... لیکن میں....."

اور ہم دونوں چپ چاپ نمناک آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

پھر کھیڑا مغلی نے ایک خوفناک چھینک لی۔

دوسرے دن میری ٹانگ کاٹ لی گئی۔

پانچویں دن میری آنکھ کھلی۔ میں ہل جل نہیں سکتا تھا۔ میں نے دیکھا، کھیڑا مغلی میری پائنتی پر بیٹھا زیرِ لب کچھ ورد کر رہا تھا۔ میری آنکھیں کھلتے ہوئے دیکھ کر وہ مسکرانے لگا۔ میں نے اپنے بدن میں کچھ طاقت محسوس کرتے ہوئے اس سے لپٹنے کے لئے کانپتے ہوئے ہاتھ پھیلا دیئے۔ میں اپنی ٹانگ کے دُکھ جانے سے بلبلا اُٹھا اور مغلی اپنے کاربنکل پر زور پڑنے سے!

مغلی کا کاربنکل اچھا ہو رہا تھا۔ اسی دوران میں میں شفا پاکر ہسپتال سے چلا گیا۔ میری غیر حاضری میں میری رفیقِ زندگی فوت ہو چکی تھی۔ اب ایک شیشم کی سخت سی دوسری لاٹھی میری رفیقِ زندگی بن گئی تھی۔ پہلی اور اس رفیقِ زندگی میں فرق صرف اتنا تھا، کہ وہ مجھے اپنی باتونی طبیعت سے نالاں رکھتی اور یہ اپنی خاموشی سے نالاں تر۔

اُسی لاٹھی کو بغل میں دبائے میں آہستہ آہستہ کام پر چلا جاتا۔ مجھے اپنی ٹانگ کے کاٹے جانے کا چنداں افسوس نہ تھا۔ میں اس بات پر خوش تھا کہ تندرست تو ہو گیا اور اپنی خواہش کے مطابق شفاخانے کے احاطے کی دیوار سے باہر۔

ایک دفعہ میں شفاخانے کے پاس سے گذرا تو میری روح تک لرز گئی۔ اس وقت میرے ساتھی اور بعد میں آئے ہوئے مریض۔ حسرت بھری نگاہوں سے ہماری دلچسپ حماقتیں دیکھنے میں محو تھے . . . . . اور احاطے کی مرمت طلب دیوار پر تین ممولے اپنی تین رنگ کی دموں کو تھرتھرا رہے تھے۔ میرے خیال میں بڑا ممولا چھوٹے ممولوں کی ماں تھی جو ہماری بیماری کے ایام میں اُسی دیوار پر اپنے انڈوں کے خول بنانے کے لیے چُونا کریدنے آیا کرتی تھی۔

اُس وقت میرے سوا اُن مریضوں کی تکلیف کو کون جان سکتا تھا۔ میں نے اُن لوگوں کی مصیبت پر چند ایک آنسو بہائے . . . . مجھے سامنے بساطی کی دوکان پر چند نوجوان لڑکیوں کا جمگھٹا دکھائی دیا۔ اُن کی ساڑھیوں کے پلّے اُسی طرح بے باکانہ طور پر اُڑ رہے تھے . . . . . اور چھت پر، چق کے پیچھے پروفیسر کی بیوی اپنی ساڑھی کی سلوٹوں کو درست کرتی ہوئی دھندلی سی دکھائی دے رہی تھی۔ میں ایک مبہم سے احساس کے ساتھ بساطی کی دوکان کی طرف بڑھا اور وہاں سے کچھ رنگدار ریشمی فیتے لاٹھی کو سجانے کے لیے خریدے اور کچھ غیر مطمئن، کھویا کھویا اور [illegible] ہوا واپس لوٹا۔

ایک دن میں شفاخانے کے اندر گیا۔ تو میں نے دیکھا۔ مغلی کا کاربنکل بہت حد تک ٹھیک ہو چکا تھا۔ ہاں! انچرج کی حالت نازک اور ناقابلِ بیان تھی . . . ان

کے بعد مجھے اپنے ایک افسر کے ساتھ چند ہفتوں کے لیے باہر جانا پڑا۔

میرے دل میں کئی بار خیال آیا۔ کھیڑا مغلی مجھے کتنا کوستا ہوگا۔ وہ تو پہلے ہی کہا کرتا تھا کہ انسان خود سکھی ہو کر اپنے گذشتہ دُکھ اور دوسروں کی تکالیف کو عمداً بھول جایا کرتا ہے۔ ہرچند یہ بات درست تھی۔ مگر بعض مجبوریوں کی وجہ سے مجھ پر عائد نہ ہوتی تھی۔

واپس آنے پر فرصت کے ایک دن میں شفاخانے گیا۔

گرڈی نے ایک روکھی پھیکی مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔ میں ڈر سے سہم گیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اشجرج تال دو دن ہوئے مکمل شفا پا کر اجمیر چلا گیا ہے۔ مگر گرڈی نے کھیڑا مغلی کی بابت کچھ نہ کہا۔

میں احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا جنرل وارڈ کی طرف گیا۔ برآمدے کے نیچے شفاخانے کے ملازم چند ایک عورتوں اور بچوں کو بلند آواز سے رونے سے منع کر رہے تھے۔ اُن عورتوں میں سے ایک کھیڑا مغلی کی ضعیف العمر اور نیم مردہ ماں تھی۔ جو اپنے بیٹے کی دائمی مفارقت کے غم میں فلک شگاف چیخیں مار رہی تھی۔ . . . پھر اُس کی بیوی . . . بچے . . . .

برآمدے کے ایک طرف مغلی موت کی میٹھی نیند سو رہا تھا۔ اُسے یوں دیکھ کر میری بغل میں سے لاٹھی گر پڑی . . . میں رو بھی نہ سکا۔

لوگوں نے چپکے سے مغلی کی میت کو اُٹھایا۔ اُسے کندھوں کے برابر کیا اور کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے لے چلے!

مَن کی مَن میں

مادھو کی بیوی کو لوگ کلا کارنی پکارتے تھے۔ اگر میں ، زیادہ نہیں بھولتا تو یہ نام گُلتارنی سے ہی بگڑ کر بنا تھا۔ مطلب گُل کی (ڈوبتی ہوئی) نیّا کو پار لگانے والی۔ یہ پیار ادُلار کا نام نہ صرف گُل کو لاج لگانے والی سے اختلاف ظاہر کرتا ہے۔ بلکہ اس کا کچھ اور بھی گہرا مطلب ہے۔ جسے مادھو کے سوا کوئی کم ہی جان سکتا ہے۔ عین اس طرح جیسے موسیقی سے فضا میں تموّج کے علاوہ ایک ایسی وجدانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جسے کچھ دل ہی سمجھ سکتا ہے اور پھر چوٹ کھایا ہُوا دل!....

سچ تو یہ ہے کہ یہ نام ہوتے ہی کچھ گورکھ دھندا سے ہیں۔ معلوم نہیں لوگ کیوں بعض وقت جنم کے اندھے کو نین سُکھ اور نپٹ گنوار و کو ودیا ساگر کہہ دیتے ہیں۔

کئی دفعہ کوئی بھولا بھالا بچّہ اچانک اپنی ماں سے سوال کر دیتا ہے کہ میں

اس دنیا میں کہاں سے آیا تو ماں گھبرا کر جواب دیتی ہے۔ بیٹا! نرالی پونما کے روز اِندر بھگوان نے بہت سا مینہ برسایا۔ اس وقت بہت سے بچے آکاش سے گرے تھے اُن میں سے ایک تم تھے۔ مجھے بہت من موہنے لگے اور میں نے تمہیں صحن میں سے اُٹھا لیا۔ یا کہتی ہے تمہارا باپ ایک سو بیالیس گھنڈیوں والا جال لے کر رام تلائی یا شلالا کے جوہڑ میں مچھلیاں پکڑنے گیا۔ وہاں نہ مچھلی تھی نہ کچھوا۔ صرف جونکیں تھیں ایک ننھا سا مینڈک عمروجولاہے کے گھر کے سامنے رُدی کے ایک گالے پر آرام سے بیٹھا ہُوا برسات کی خوشی میں گا رہا تھا۔ وہ تمہیں تھے۔ تمہارا باپ تمہیں اُٹھا لایا اور ہم نے پال لیا۔ کچھ ایسی ہی بات ہم نے مادھو کے متعلق بھی سُنی تھی کہ وہ چکنی مٹی کے ایک ڈھیلے سے بنا تھا ——— ادھر ی ندیا میں طغیانی آنے پر مٹی کے ایک ڈھیلے نے رام تلائی کے مندر میں ٹھاکر جی کے چرنوں کو چھوا۔ مٹی پانی اور ہوا تو پہلے ہی موجود تھے۔ آکاش اور آگ ملی تو بچہ بن گیا اور یہ سب کچھ ٹھاکر جی کی دیا سے ہُوا۔ گلاب گڑھ کے تمام پرائمری پاس یا مڈل فیل آدمی اس بات کو ماننے سے صاف انکار کر دیتے ہیں، بھلا وہ اس بات کا جواب تو دیں کہ سیتا جی کس طرح کھیت میں دبائے ہوئے ایک گھڑے کو ہل کی ٹھوکر لگ جانے سے پیدا ہو گئیں؟ کرن جی کس طرح کنتی جی کے کانوں کی میل سے بن گئے؟ رام چندر جی کے دوسرے بیٹے کُش کو کُشا یعنی گھاس سے کیسے بنا لیا گیا؟

خواہ مادھو مٹی کے ایک ڈھیلے سے بنا تھا۔ پھر بھی اُسے مٹی کا مادھو نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک بہت سمجھ دار آدمی تھا۔ اگر گھر کے آدمی اُسے مٹی کا مادھو سمجھتے تھے تو سمجھا کرتے۔ گھر کا جوگی جوگڑا ...... گھر والوں کو یہی شکایت تھی ناکہ

مادھو گھر کا کام کاج کرنے کی بجائے دوسروں کا کام کر کے زیادہ خوش ہوتا تھا اور حقیقت میں اس بات سے مادھو کی تعریف ہی کا پہلو نکلتا ہے۔

ہاں! کچھ مادھو کی صورت کے متعلق۔ وہ قد کا گٹھیلا تھا اور جسم کا اکہرا عمر بھی کوئی چالیس پنتالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ چہرے پر چیچک کے داغ گورے رنگ سے گھی کھچڑی ہو رہے تھے۔ کلکارنی کی آنکھیں تو رسیلی تھیں ہی۔ مگر مادھو کی زیادہ دور تک مار کرتی تھیں۔ قدرے باہر کو اُبھری ہوئی تھیں . . . . اتنی اُبھری ہوئی کہ سوتے میں در فتنہ کی طرح ہمیشہ نیم باز رہتیں۔ گلاب گڑھ کے پرائمری سکول کے منشی بھائی گریب داس جو کبھی کبھی شہر میں جا کر ایک آدھ ردی سی فلم کے نظارے سے مستفیض ہو آیا کرتے تھے۔ مادھو کی آنکھوں کو پیا ملن کی آس مار کر آنکھیں کہا کرتے تھے۔ اور اُن کے ہونہار شاگرد اپنے اُستاد کے ارشاد پر تضمین کرتے۔ یا بالکل تجدید کرتے ہوئے مادھو کو "مگا ڈر نینا" کہتے تھے۔

کلکارنی زندگی کے روشن پہلو اور مادھو تاریک پہلو کو دیکھنے کا عادی تھا۔ دونوں میں ایک دلچسپ مگر خطرناک فطری تضاد تھا۔ اس وجہ سے اکثر اُن کی آپس میں ایک آدھ جھپٹ ہو جایا کرتی۔ مادھو کی قنوطیت اس درجہ نمایاں تھی کہ جو کوئی اُسے بازار میں ملتا تو بجائے جے رام جی کی یا صاحب سلامت کے کہتا۔

"کہو بھئی مادھو —— من کی من میں رہی؟"

فنا کا نمائندہ اور قنوطیت کا علمبردار فی الفور ایک گہرا، ٹھنڈا سانس لیتا اور کہتا۔

"ہاں . . . . بھائی —— من کی من میں رہی!"

اور اس قسم کا طریقۂ تخاطب کلکارنی کو سر سے پاؤں تک جلا دیتا۔ کیا کرتی وہ؟

گلاب گڑھ کے لوگ تو اُس کی شادی سے پہلے ہی مادھو کو اس کی یاس پسندی کی وجہ سے یوں خطاب کرنے کے عادی تھے انہیں روکنا اُس پودے کو موڑنے کے برابر تھا جو ایک خاصا تن آور درخت بن چکا ہو۔ بہر حال وہ بہت ہی جھلاتی اور جو کوئی مادھو کو یوں خطاب کرتا۔ اگلے روز اُس کی بیوی، ماں یا بہن سے کلکارنی کی لڑائی ہوتی، اور کلکارنی جواب طلب کرتی "آخر اس من کی من میں رہی کا مطلب کیا؟"

مادھو کلکارنی کے اس احتجاج پہ بہت خوش ہوتا۔ دفلی بجاتا اور کہتا۔

"میری زندگی کلکارنی کو کتنی پیاری ہے۔ کسی کو من کی من میں رہی کہنے ہی نہیں دیتی۔ حالانکہ نہ اُسے ہنسلی بنوا کر دی ہے اور نہ پازیب..... ارے نین جھینے سے تو پیٹ رہی ہے۔"

ایک دن میں نے مادھو کو یک بیک فلسفی بنتے دیکھا۔ منشی گربپ داس کے سامنے وہ عورت کی محبت و مروت کو سراہ رہا تھا — کنگرو کی قلابچ سے زیادہ عجیب اُجڈ اور دیہاتی انداز میں..... اور کون نہیں بھانپ سکتا تھا کہ اس کا اشارہ کلکارنی کی طرف ہے۔ اُس کے لفظ تھے۔

"بھائی گربپ داس..... اگر دنیا عورت کی بجائے آدمی کے پیٹ سے پیدا ہونے لگے تو دنیا پریم اور نرمی کا نام ہی نہ رہے۔ عورت آدمی کو اپنی کوکھ سے جنم دے کر اس کے اکھڑپن کو دور کر دیتی ہے۔"

کتنا حقیقت سے لبریز تھا۔ مادھو کا عملی فلسفہ۔ ایسی لاکھوں کی ایک سُن کر بھی جو مادھو کو مٹی کا مادھو کہے۔ کیا وہ خود مٹی کا مادھو نہیں ہے؟"

بُرج والے کنوئیں کی بٹیرا جھرکل، ڈھول یا لٹھ ٹوٹتی تو ٹوٹ جائے گی۔ مگر مادھو

اُس کی طرف متوجہ نہ ہوگا۔ بیلوں کی جوڑی سے زیادہ سے زیادہ کام لے کر کم سے کم چارہ ڈال کر اُس کے مزارع دو دو سو کے بیلوں کی جوگ کو ایسی ناکارہ بنادیں گے کہ کلو شاہ کے بھرے میلہ میں اُن کی قیمت پچاس پچاس روپے سے کوڑی نہ بڑھے گی۔ گھر میں کسی خوشی یا غم کے موقع پر مادھو سے کسی قسم کی توقع بے کار ہوگی۔ مگر وہ دوسروں کی مدد کے لیے کتنی جلدی لنگر لنگوٹا کسے گا۔۔۔۔ گلاب گڑھ میں ایک بیوہ اجبو رہتی تھی۔ اُس کے خاوند رُلیا کو مرے سات سال کے قریب ہوئے تھے۔ اُسی روز سے بے چاری اپنی عزّت کو سنبھالے بیٹھی تھی۔ اگر اُسے سماج کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو بیچاری کبھی کی تباہ و برباد ہو چکی ہوتی۔ مادھو کو اُس کی مدد کرتا دیکھ کر لوگ کئی طرح کے بہتان لگاتے، طرح طرح کی باتیں بناکر معصوم مادھو اور بدنصیب بیوہ کو بدنام کرتے۔ سماج میں اتنی دیا کہاں کہ جس چیز کو وہ خود دینے سے ہچکچاتی ہے۔ اپنے کسی فرد کو دیتا دیکھے۔ اجبو کی مدد پر لوگوں کی مخالفت نے دونوں کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ اور اس مخالفت میں کلکارنی سب کی پیشوائی کرتی تھی۔

اگر یہ سچ ہے کہ کسی غیر مرد کا یوں بیوہ کی مدد کرنا پاپ ہے تو یہ بھی سچ ہے کہ سماج کے دائرہ میں رکھ کر ایسی شکستہ حال بیوہ کے رہے سہے گوشت پوشت کو نوچ نوچ کر کھاتا کوئی پاپ نہیں!

ایک دن مادھو کہیں باہر سے آیا۔ وہ چہرے سے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

"مجھے بیس روپے دو گی ــــ کارنی؟" مادھو نے گاڑھے کی چادر کو شانے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"کیا کرو گے اتنے روپوں کو؟"

مادھو کو اسی سوال کی توقع تھی۔ گلکارنی کو اس بات کا وہم رہتا تھا کہ مادھو اپنی سخاوت پسند طبیعت کی وجہ سے جا و بے جا روپیہ خرچ کرتا رہتا ہے اور اس کا عقیدہ تھا کہ جو آپ کھایا سو کھایا جو کھلایا سو گنوایا۔ وہ روپیہ جمع بھی کرتی تو اس لیے کہ زندگی میں کبھی کام آئے گا گویا وہ ہمیشہ جیتی رہے گی —— اتنی لمبی آس —— اور شرادھ میں گئے گذروں کے نام پر وہ بہت سارو پیہ دان بھی کرتی۔ مگر اس قسم کے دان سے مادھو متفق نہیں تھا۔

"کیا کرو گے ان روپوں کو؟" اس سوال کا جواب مادھو نے پہلے ہی سے اپنے ذہن میں تراش رکھا تھا۔ فوراً بولا۔

"چند دن ہی ہوئے تو خود ہی ہنسلی اور پازیب کے لیے کہہ رہی تھی۔۔۔ میں باہر جا رہا ہوں۔ بنوا لاؤں گا۔"

گلکارنی اچھل پڑی۔ بھلا ہنسلی اور پازیب کے لیے کون بیس روپے نہ دے گا۔ وہ فوراً گندم کے ڈھیر میں چھپائی ہوئی ہانسلی اٹھا لائی اور بیس کے بجائے پچیس روپے مادھو کی کمر میں بندھوا کر بولی۔

"سنو، کل سگرانت ہے۔۔۔ مکر سگرانت، تمہارے بعد ہٹنے کا پہلا تیوہار ہوگا۔ ہو سکے تو سنار کے پاس ہی بیٹھ کر ہنسلی ڈھلوا لینا نہیں تو اس کے عوض کوئی اور ہی لے آنا۔۔۔ پل کی پل پہن لوں گی۔ جلدی آنا میں نے تیوہار منانے کا بندوبست کر لیا ہے۔"

مادھو نے کمر میں بندھی ہوئی ہانسلی پہ ایک چست سی صدری ڈالی اور چل دیا۔

سگرانت بھی آگئی۔ اس دن سورج دھن راسی سے نکل کر مکر راسی میں داخل ہوتا ہے۔

اس لیے اسے مکر سگرانت کہتے ہیں۔ سگرانت کی دیوی نے سوائے مادھو کے باپ کے گلاب گڑھ تو گیا تمام دنیا میں سے پاپ کی بیخ کنی کے لیے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو پھیلا اور ترشول تان کر دنیا کا سفر کرنا شروع کر دیا تھا۔ سجی دھجی عورتیں تل، گڑ، بیر، امرود اور گنڈیریاں بانٹ رہی تھیں۔ پریم کے اس تبادلے کو "اُدّی بھرن" کہتے ہیں۔ اُدّی بھرن کرتے ہوئے وہ غیر ارادی طور پر ہماری زندگی میں ایک رُوح پھونک دینے والا پیغام دے رہی تھیں۔ دراز سے دراز اور سیاہ سے سیاہ زبان رکھنے والی عورت بھی اپنے چہرے کو ایک عارضی مسکراہٹ سے مزین کرتے ہوئے کہہ رہی تھی "میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا بولو"۔

چونکہ مادھو کے بہو بیٹے کا پہلا تیوہار تھا۔ دونوں کو صحن کے وسط میں ایک دھوتی اور ایک لنگوٹی بندھوا کر بٹھا دیا گیا۔ جسم پر تیل اور دہی ملا گیا۔ اس کے بعد بہو کی بہن نے بہو کو اور دُولہا کی بہن نے دُولہا کو سیٹھے گاتے ہوئے نہلایا۔ کونے میں بیٹھے ہوئے آدمیوں نے چند پرانے سے ناقوس اور نفیریاں بجائیں۔ دو پہر چوٹ پڑی، کلکارنی نے سیندور، مصری اور ناریل بانٹا۔ اُس وقت مادھو کا بدھائی لینے کے لیے وہاں ہونا لازمی تھا۔ مگر وہ کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ کلکارنی کو تو اپنی ہنسلی اور پازیب کی پڑی تھی۔ وہ رہ رہ کر مادھو کو کوستی اور اپنے گلے اور ایڑیوں کو ساڑھی کے پلوؤں سے چھپاتی۔۔۔ کلکارنی جان گئی کہ سنار نے ہنسلی بناتے ہوئے دیر لگا دی ہوگی۔

کبھی کبھی اُسے خیال آتا۔ شاید مادھو میری زیادتیوں کی وجہ سے مجھ سے روٹھ گیا ہو۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سگرانت کے دن رُوٹھے منائے جاتے ہیں۔ مگر سیدھا سادا مادھو اتنے چھل بل کہاں جان سکتا تھا۔۔۔ سُنار کے پاس آدمی دوڑایا گیا تو پتہ چلا کہ مادھو وہاں

پہنچا ہی نہیں۔

مادھو کی ڈھونڈ۔ پاٹی۔ کوئی بچہ تھوڑے ہی تھا کہ راستہ بھول جاتا۔ کلکارنی کی تشویش بڑھی۔ اُس نے چاروں طرف آدمی بھیجے۔ اِس میں شک نہیں کہ مادھو نے گھر کلی طور پہ کلکارنی سی ہوشیار عورت کو سونپ رکھا تھا۔ مگر وہ اتنا بے مہر نہیں تھا کہ اپنے بہو بیٹے کے پہلے تیوہار کے شگن منانے سے احتراز کرتا۔

شام تک مادھو نہ پہنچا کلکارنی کی ہنسلی اور پازیب۔ کلکارنی کا غصہ اور فکر دونوں سُرعت سے بڑھنے لگے۔

جب شام کو دیوں کو دیا سلائی دکھائی گئی تو عورتیں سب کی سب ایک۔ ایک کر کے رخصت ہو گئیں۔ پہلے شور و غوغا سے آشنا کان برابر کی خاموشی کو پاکر سائیں سائیں کرنے لگے۔ اس وقت کلکارنی کے کانوں میں ایک دھیمی سی آواز آئی۔ اس کا پڑوسی بنجارہ کہہ رہا تھا...

"کہو بھائی . . . . مادھو من کی من میں رہی ؟"

جواب میں ایک مردہ سی آواز آئی "ہاں بھائی! من کی من رہی!"

اب تک تو کلکارنی کا فکر اُس کے غصہ پہ غالب تھا۔ لیکن مادھو کو بے آنچ پہنچے اور پھر برس کے برس ' دل میں من کی من میں رہی کے الفاظ کہتے سُن کر اس کا غصہ فکر پہ غالب آگیا۔ وہ سر سے پاؤں تک راکھ ہی تو ہو گئی۔ بجلی کی مانند لپکی صحن میں آئی ڈیوڑھی میں پہنچ کر دروازے کی زنجیر اندر سے چڑھا دی۔ ننگی ایڑیوں کو دیکھ کر اس کا غصہ اور بھی چمک اٹھا۔ اس اثنا میں مادھو دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا اور سردی سے کانپ رہا تھا۔ یہ ماگھ کی سردی جگر تک پہنچتی ہے۔ کانپتے ہوئے مادھو نے کلکارنی سے دروازہ کھولنے کے لیے منت کی۔

اندر سے آواز آئی "چلے جاؤ ــــ باہر ہی رہو۔ اب تمہاری ضرورت ہی کیا ہے؟ جدھر منہ اٹھائے ہو اُدھر چلے جاؤ ــــ اُتر ہے تو اُتر کو، دکھن ہے تو دکھن کو۔۔ گھر کیا ہے ہنسی کھیل بنا رکھا ہے۔ بڑے سونٹھ کی جڑ تلاش کرنے گئے تھے۔۔۔ اتنا بھی نہیں سوجھا گھر میں خوشی ہے۔۔۔ پرمیشر نے چاہا تو، یہ من کی من میں رہے گی۔۔۔ واویلا کیوں کرتے ہو۔"

مادھو کچھ دیر کے لیے ٹھٹک گیا۔ پھر بولا "دروازہ تو کھولو ــــ کلا رنی، دیکھو سردی کے مارے اکڑ رہا ہوں۔ تمہاری ہنسلی، اور پازیب ہی بنوانے گیا تھا۔"

"میں جانتی ہوں سنار کے پاس تو تمہاری پرچھائیں تک نہیں پہنچی۔۔۔ سچ سچ کہو کیا تم اُس میری سوت کے پاس نہیں گئے تھے؟"

"کون سوت؟"

"امبو ــــ اور میری سوت کون ہو گی؟"

حقیقت میں مادھو اسی کے پاس گیا تھا۔ کلکارنی کے سامنے اس بات سے انکار کرنے کی جرأت نہ پڑی۔ اور وہ انکار کرتا بھی کیوں؟ ــــ بولا ــــ

"ٹھیک ہے کارنی ــــ امبو بہن نے کہلا بھیجا تھا۔ ساہوکار نے ایک ایک روپے کے دو اور دو دو کے تین تین بنا لیے ہیں۔۔۔۔ اور میں نے بیس روپے تم سے دراصل اسی لیے مانگے تھے۔ تمہاری ہنسلی میں اپنے پیسوں سے بنوا دوں گا۔ جوڑا کہ گھر میں جمع ہیں۔ فکر نہ کرو۔ دروازہ تو کھولو۔"

مادھو کو کوئی جواب نہ ملا۔ کلکارنی کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"برس دن کے بعد ایک آدھ دن خوشی کا آتا ہے۔۔۔ اُس میں بھی دُکھ ہی ملتا ہے۔۔۔ بہو بیٹے کا تہوار روز روز نہ آئے گا۔۔۔ سہیلے روز روز گائے جائیں گے۔۔۔

ایسے موقع پر خوشی کو دبا کر کون دق مول لے . . . . یہ ہیں کہ . . "

مادھو نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔

"کسی بہن بھائی کو دکھی دیکھ کر مجھ سے تو مدن اور رتی کے سہیلے نہ گائے جاتے ہیں نہ گائے جائیں گے!"

کلکارنی نے دروازہ نہ کھولا . . . .

مگر اُسے نیند کہاں آتی تھی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد اُس نے آہستہ سے کواڑ کھولے تو دیکھا۔ اس کا مجازی خدا دروازہ کی چوکھٹ پر سر ٹیک کر اُونگھ گیا تھا۔ اس کے گھٹنے چھاتی سے لگ رہے تھے۔ کلکارنی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ شرمندگی کے ایک گہرے احساس سے اُس نے مادھو کا شانہ ہلایا۔ بولی۔

"میں کہتی ہوں . . . "

" . . . . "

میں کہتی ہوں . . . چلو گے؟ اندر . . "

مادھو نے آنکھیں ملتے ہوئے سر اٹھایا۔ اور بولا " ہاں . . . چلوں گا!"

مادھو اندھیرے میں اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ سردی میں ہاتھ سُن ہو رہے تھے۔ یوں گمان ہوتا تھا جیسے وہ اُس کے اپنے نہیں ہیں۔ کلکارنی نے جلدی سے انگیٹھی جلائی مادھو کے اکڑے ہوئے جسم کو گرم کیا اور اُس کے پاؤں پر سر رکھ کر دیر تک روتی رہی ـــ اور یہ رونا دھونا کاہے کا . . . مادھو کو تو ذرا بھی غصہ نہیں تھا!

نصف شب کے قریب مادھو کو چھاتی میں کچھ درد محسوس ہُوا۔ باقی رات وہ چھاتی کو دباتا اور کراہتا رہا۔ کلکارنی نے گھی گرم کر کے جائفل گھوٹ کر مالش بھی کی۔ مگر مادھو کا دکھ

بڑھتا گیا۔ صبح ہوتے ہوتے اُس کی تکلیف بہت ہی بڑھ گئی۔ دور نزدیک سے سیانے لائے گئے۔ مادھو کو نمونیا ہو گیا تھا۔ اُس کے دونوں پھیپھڑے شل ہو گئے تھے۔ سانس مشکل سے آتی تھی۔ کارنی کہتی تھی کہ نمونیا وغیرہ کچھ نہیں۔ امبو بہت گنڈے تعویذ جانتی ہے۔ اس نے کچھ نہ کچھ دے دیا ہوگا۔ اگر وہ گذشتہ شب کے واقعہ کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اپنا قصور مان لیتی تو وہ دیوی سے کم کیا ہوتی۔ مگر وہ تو محض ایک عورت تھی!

دوپہر کے قریب کچھ افاقہ ہوا۔ اُس نے کارنی کو بلایا اور بولا۔

"میں نے سُنا ہے۔ . . . کہ تم نے امبو کو اندر تک نہ آنے دیا۔ صبح جب وہ میری خبر لینے کے لیے آئی تھی . . . . کیوں؟"

"نہ جانے کیوں!"

"تم جانتی ہو میں امبو بہن سے بہت پیار کرتا ہوں . . ."

"ہاں . . . مگر میں جگ ہنسائی نہیں چاہتی۔ تمام دنیا میرے پیچھے کتے لگائے گی . . . جانتے بھی ہو دنیا کو . . . ؟"

"جانے دو دنیا کو" مادھو نے بائیں پھیپھڑے میں درد کی ایک ٹیس محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "اب جب کہ میں مر رہا ہوں۔ مجھے دنیا کی پرواہی کیا ہے . . . میرے پاس تو اتنے بول بھی نہیں کہ میں امبو بہن اور اس کے ساتھ اپنے رشتے کی پاکیزگی کا دعویٰ کر سکوں . . . ہائے . . . تم اپنے مرتے ہوئے پتی کو بچن دو کہ تم اپنی زندگی میں اُس غریب کی ایسے ہی خبر گیری کرتی رہو گی . . . اُسے اپنے پاس بلا لو گی . . . کہو تو . . ."

"میری خبر گیری کون کرے گا؟ . . . تمہارے دشمنوں کو . . ." کلکارنی زار و قطار روتے ہوئے بولی۔

مادھو نے آسمان کی طرف اُنگلی اٹھائی۔

مادھو دنیا کو چھوڑ رہا تھا۔ مگر کارنی دُنیا سے چمٹی ہوئی تھی۔ اُس نے تو مادھو کو خالی تسکین دینے کے لیے بھی اثبات میں سر نہ ملایا۔ وہ بالکل اُس آدمی کی طرح تڑپتا رہا۔ جس کے دِل میں بہت سی خواہشیں ہوں۔ مگر موت اُس کا گلا آ دبائے.... کچھ دیر بعد مادھو کا درد ہمیشہ کے لیے مٹ گیا۔

مرنے کے بعد مرحوم کی جو آخری باتیں نمایاں طور پر یاد آتی ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ تھی۔ "کسی بھائی بہن کو دکھی دیکھ کر مجھ سے مدن اور رتی کے سہیلے نہ گائے جاتے ہیں نہ گائے جائیں گے!"

ہمارے ملک میں تہوار ہی تہوار تو ہیں اور رہیٔ کیا؟ کاش یہاں کوئی تہوار نہ ہوتا بیوائیں اور یتیم تو رونے سے بچ جاتے۔ پھر ایک بار مکر سگرانت آگئی۔ پھر سورج دھن راسی سے مکر راسی میں داخل ہوا۔ سگرانت کی دیوی نے سماج کے کلنک یعنی امبو کے پاپ کے سوا تمام دنیا میں سے پاپ کی بیخ کنی کے لیے اپنی بڑی بڑی ڈراؤنی آنکھوں کو پھیلا اور ترشول تان کر دنیا کا سفر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اوٹی بھران کرتے ہوئے دراز سے دراز اور سیاہ سے سیاہ زبان رکھنے والی عورت بھی اپنے چہرے کو ایک عارضی مسکراہٹ سے مزین کرتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ "میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا بولو۔"

پھر موقع آیا کہ برسوں کے روٹھے ہوئے منائے جائیں۔ امبو سے تو گاؤں کا ہر ایک بچہ بوڑھا روٹھ گیا تھا۔ وہ کس کس کو مناتی۔ ایک اُرلیا اور مادھو کے رُوٹھ جانے سے کائنات کا ذرہ ذرہ اُس سے روٹھ گیا تھا۔ ہائے! اُرلیا اور مادھو ایسے روٹھنے والے کوئی

ماننے کے لیے تھوڑے ہی رد ٹھے تھے!

امبو کے گھر میں کانسی کے چمکتے ہوئے برتن بالکل سونے کے بنے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ جھونپڑی میں لیپ پوت یوں کیا گیا جیسے امبو کے گھر میں کوئی آنے والا ہو۔ کبھی کبھی وہ آنکھ اُٹھا کر باہر دیکھ لیتی۔ کیا عجب جو کہیں گھومتا پھرتا رلیا ہی آجائے۔ نہیں تو مادھو کی صورت ہی دکھائی دے جائے!

مادھو کے بیٹے میں امبو کو مادھو بھائی کی ہی روح نظر آتی تھی۔ اگرچہ وہ جانتی تھی کہ گاؤں کے لوگ عام طور پر اور کلکارنی اور اس کی بہو اور بیٹا خاص طور پر اُس کی شکل دیکھنے سے بیزار ہیں۔ کیونکہ اُسی نے تو مادھو کو کوئی جنتر منتر دے دیا تھا۔ پھر بھی اُس نے ایک کانسی کی تھالی میں کچھ گاجریں، مٹر، امرود، بیر اور گنڈیریاں وغیرہ رکھیں تاکہ مادھو کی بہو کو دے۔ اپنی پھٹی ہوئی ساڑھی کے ایک پلّو سے اُس نے تھالی کو ڈھانپا اور مادھو کے گھر کی طرف چل دی۔

امبو کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ وہ دہلیز کے اندر قدم رکھے۔ ایک برس پہلے لوگوں کی مخالفت کے باوجود اس کی اس گھر میں پوچھ ہوتی تھی، آج وہ اس گھر میں کون تھی۔ ایک عورت نے اُسے اندر آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"لو بہن ...... وہ رہی تمہاری سوت"

کلکارنی اُسے دیکھ کر جل بھن گئی۔ آہستہ سے بولی "مرتی بھی نہیں کمبخت ..... مرے تو میں آٹے میں لوبان اور گھی ریندھوں ... دودھ کا کٹورا پیوں ... گنگا نہاؤں نہ جانے کیا کیا کروں"

جب امبو بالکل نزدیک آگئی تو کلکارنی اپنے چہرے کو ایک عارضی مسکراہٹ سے

مزین کرتی ہوئی بولی۔

"آؤ بہن!... میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا بولو!"

امبو نے اُن دونوں کی باتیں تھوڑی بہت سن لی تھیں۔ سوت کا لفظ کان میں پڑتے ہی اُس کا تمام جسم کانپنے لگا۔ بے ساختہ اُس کی زبان سے نکلا "بھیا کہاں ہیں؟"

دوسری عورتیں مسکرانے لگیں۔

پچھلے سال ٹھیک اسی دن مادھو اس سے آخری بار ملنے گیا تھا۔ اس بات کو یاد کرتے ہوئے امبو کا دل مسلا گیا۔ کلکارنی ایک کونے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اُسے بھی پچھلی سگرانت یاد آگئی۔ ٹھیک اسی دن امبو نے مادھو کا کلیجہ نکال لیا تھا۔ مگر وہ اس سگرانت کی رات کا واقعہ بالکل بھول گئی تھی۔ صرف اُسے مادھو کے وہ الفاظ یاد تھے۔ "کسی بھائی بہن کو دکھی دیکھ کر مجھ سے مدن اور رتی کے ہیبلے نہ گائے جاتے ہیں۔ نہ گائے جائیں گے۔"

تمام عورتیں ہنستی کھیلتی رہیں۔ پھر اوٹی بھرن کیا گیا۔ سہاگنوں نے ایک دوسری کی مانگ میں سیندور لگایا۔ جب کلکارنی کی بہو کی مانگ میں ٹپہ کی ایک دلہن نے سیندور لگایا تو امبو وہیں کھڑی رہی۔ سہاگن کے پاس بیوہ کھڑی رہے۔ رام رام!... کارنی نے امبو کو بازو سے پکڑا اور دھکا دے کر برآمدے سے باہر کر دیا۔ بولی:

"دیکھتی نہیں کیا ہو رہا ہے...؟"

امبو نے چاروں طرف دیکھا کہ کوئی اس کی طرف تو نہیں دیکھ رہا۔ مگر سب کی نظریں اُسی کی طرف تھیں۔ امبو نے منہ چھپا کر رونا چاہا۔ مگر وہ رو بھی تو نہ سکتی تھی۔ برس کا برس دن اور رونا! کارنی جان ہی تو نکال لے گی! اگر رونا برس کے بر

روز اور عام دن میں کوئی بھی تمیز نہیں کرتا۔ وہ آپی آپ آجاتا ہے۔ بلکہ یتیم اور بیوہ کو تو مانس کے برس دن ہی تو آتا ہے۔ اسی دن مرے ہوئے بالکل نزدیک آجاتے ہیں۔ ساتھ ہی اُٹھتے ہیں —— ساتھ ہی بیٹھتے ہیں، ہنسو تو ہنستے ہیں۔ روؤ تو روتے ہیں اور گلے مل مل کر رتے ہیں۔ کوئی انہیں دیکھتا ہے کوئی نہیں دیکھتا!

پڑوس کی بنجارن امبو کے پاس سے گزری اور محض امبو کو سنانے کی غرض سے گنگنانے لگی —— "پتی بِنا کا ایک ہے دِھپارن کے دوتے!"

—— اور پھر سگمانت کے شور و غوغا میں شامل ہوتے ہوئے بولی ... "میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا بولو!"

امبو کو زمین میں جگہ نہیں ملتی تھی کہ اس میں سما جائے۔ اس گومگو کی حالت میں کلکارنی نے اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ وہ محض دنیا سے چھٹی ہوئی تھی اور مادھو کے آخری الفاظ کا اسے کوئی خیال نہ تھا۔

اگلی صبح لوگ کہہ رہے تھے "نہ جانے امبو کہاں چلی گئی؟"

سماج کے ماتھے سے اس کلنک کے ٹیکے کو کلکارنی نے ہی تو دھویا تھا۔ لوگ اُس سے خوش تھے اور جب وہ بہت خوش ہو کر عقیدت سے کہتے "بھئی کلکارنی نے اپنے نام کی لاج رکھ لی" تو سُوکھا سا منہ بنا کر بھائی گریب داس ایک ٹھنڈا سانس لیتا اور کہتا:

"—— آہ! مگر غریب مادھو کے من کی من ہی میں رہی!"

گرم کوٹ

میں نے دیکھا ہے۔ معراج الدین ٹیلر ماسٹر کی دکان پر بہت سے عمدہ عمدہ سوٹ آویزاں ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر اکثر میرے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ میرا اپنا گرم کوٹ بالکل پھٹ گیا ہے اور اس سال ہاتھ تنگ ہونے کے باوجود مجھے ایک نیا گرم کوٹ ضرور سلوا لینا چاہیے۔ ٹیلر ماسٹر کی دکان کے سامنے سے گزرنے یا اپنے محکمہ کی تفریح کلب میں جانے سے گریز کروں تو ممکن ہے مجھے گرم کوٹ کا خیال ہی نہ آئے کیونکہ کلب میں جب سنتا سنگھ اور یزدانی کے کوٹوں کے نفیس ورسٹڈ (WORSTED) میرے متخیلہ پر تازیانہ لگاتے ہیں تو میں اپنے کوٹ کی بوسیدگی کو شدید طور پر محسوس کرنے لگتا ہوں یعنی وہ پہلے سے کہیں زیادہ پھٹ گیا ہے۔

بیوی بچوں کو پیٹ بھر روٹی کھلانے کے لیے مجھ معمولی کلرک کو اپنی بہت سی

ضروریات ترک کرنا پڑتی ہیں اور انہیں جگر تک پہنچتی ہوئی سردی سے بچانے کے لئے خود موٹا جھوٹا پہننا پڑتا ہے...... یہ گرم کوٹ میں نے پار سال دہلی دروازے سے باہر پرانے کوٹوں کی ایک دکان سے مول لیا تھا۔ کوٹوں کے سوداگر نے پرانے کوٹوں کی سینکڑوں گانٹھیں کسی مرانجا مرانجا اینڈ کمپنی کراچی سے منگوائی تھیں۔ میرے کوٹ میں نقلی سلک کے استر سے بنی ہوئی اندرونی جیب کے نیچے مرانجا مرانجا اینڈ کو، کا لیبل لگا ہوا تھا۔ مگر کوٹ مجھے ملا بہت سستا جھنگا روئے ایک بار سستا روئے بار بار——

اور میرا کوٹ ہمیشہ ہی پھٹا رہتا تھا۔

اسی دسمبر کی ایک شام کو تفریح کلب سے واپس آتے ہوئے میں ارادتاً انار کلی میں سے گذرا۔ اس وقت میری جیب میں دس روپے کا نوٹ تھا۔ آٹا، دال، ایندھن، بجلی، بیمہ کمپنی کے بل چکا دینے پر میرے پاس وہی دس کا نوٹ بچ رہا تھا...... جیب میں دام ہوں تو انار کلی میں سے گذرنا معیوب نہیں۔ اس وقت اپنے آپ پر غصہ بھی نہیں آتا۔ بلکہ اپنی ذات کچھ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت انار کلی میں چاروں طرف سوٹ ہی سوٹ نظر آ رہے تھے اور ساڑھیاں، چند سال سے ہر نتھو خیرا سوٹ پہننے لگا ہے...... میں نے سنا ہے گذشتہ چند سال میں کئی ٹن سونا ہمارے ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ شاید اسی لئے لوگ جسمانی زیبائش کا خیال بھی بہت زیادہ رکھتے ہیں۔ نئے نئے سوٹ پہننا اور خوب ٹھاٹھ سے رہنا ہمارے افلاس کا بدیہی ثبوت ہے۔ ورنہ جو لوگ سچ مچ امیر ہیں۔ ایسی شان شوکت اور ظاہری تکلفات کی چنداں پروا نہیں کرتے۔

کپڑے کی دکان میں ورسٹڈ کے تھانوں کے تھان کھلے پڑے تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔ کیا میں اس مہینے کے بچے ہوئے دس روپوں میں سے کوٹ کا کپڑا

خرید کر بیوی بچوں کو بھوکا ماروں؟ لیکن کچھ عرصہ کے بعد میرے دل میں نئے کوٹ کے پاگل خیال کا ردِ عمل شروع ہوا۔ میں اپنے پرانے گرم کوٹ کا بٹن پکڑ کر اسے بل دینے لگا۔ چونکہ تیز تیز چلنے سے میرے جسم میں حرارت آگئی تھی۔ اس لیے موسم کی سردی اور اس قسم کے خارجی اثرات میرے کوٹ خریدنے کے ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے قاصر رہے۔ مجھے تو اس وقت اپنا وہ کوٹ بھی سراسر تکلف نظر آنے لگا۔

ایسا کیوں ہوا؟ میں نے کہا ہے جو شخص حقیقتاً امیر ہوں وہ ظاہری شان کی چنداں فکر نہیں کرتے۔ جو لوگ سچ مچ امیر ہوں انہیں تو پھٹا ہوا کوٹ بلکہ قمیص بھی تکلف میں داخل سمجھنی چاہیے تو کیا میں سچ مچ امیر تھا کہ ......؟

میں نے گھبرا کر ذاتی تجزیہ چھوڑ دیا اور بمشکل دس کا نوٹ صحیح سلامت لیے گھر پہنچا۔

شمی، میری بیوی، میری منتظر تھی۔

آٹا گوندھتے ہوئے اس نے آگ پھونکنی شروع کر دی ۔۔۔ کم بخت منگل سنگھ نے اس دفعہ لکڑیاں گیلی بھیجی تھیں۔ آگ جلنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ زیادہ پھونکیں مارنے سے گیلی لکڑیوں میں سے اور بھی زیادہ دھواں اٹھا۔ شمی کی آنکھیں لال انگارہ ہوگئیں۔ ان سے پانی بہنے لگا۔

"کم بخت کہیں کا ...... منگل سنگھ" میں نے کہا "ان پُرنم آنکھوں کے لیے منگل سنگھ تو کیا میں تمام دنیا سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو جاؤں ......"

بہت تگ و دو کے بعد لکڑیاں آہستہ آہستہ چٹخنے لگیں۔ آخر ان پُرنم آنکھوں کے پانی نے میرے غصے کی آگ بجھا دی ...... شمی نے میرے شانہ پر سر رکھا اور میرے پھٹے ہوئے گرم کوٹ میں پتلی پتلی انگلیاں داخل کرتی ہوئی بولی:

"اب تو یہ بالکل کام کا نہیں رہا۔"

میں نے دھیمی سی آواز سے کہا "ہاں!"

"سی دوں؟.... یہاں سے....."

"سی دو۔ اگر کوئی ایک آدھ تار نکال کر رفو کر دو تو کیا کہنے ہیں۔"

کوٹ کو اُلٹاتے ہوئے شمی بولی: "استر کو تو موٹی ٹڈیاں چاٹ رہی ہیں.... نقلی ریشم کا ہے نا..... یہ دیکھئے۔"

میں نے شمی سے اپنا کوٹ چھین لیا اور کہا "مشین کے پاس بیٹھنے کی بجائے تم میرے پاس بیٹھو شمی..... دیکھتی نہیں ہو دفتر سے آ رہا ہوں...... یہ کام تم اس وقت کر لینا جب میں سو جاؤں۔"

شمی مسکرانے لگی۔

وہ شمی کی مسکراہٹ اور میرا پھٹا ہوا کوٹ!

شمی نے کوٹ کو خود ہی ایک طرف رکھ دیا۔ بولی: "میں خود بھی اس کوٹ کی مرمت کرتے کرتے تھک گئی ہوں...... اسے مرمت کرنے میں اس گیلے ایندھن کو جلانے کی طرح جان مارنی پڑتی ہے۔ آنکھیں دکھنے لگتی ہیں...... آخر آپ اپنے کوٹ کے لئے کپڑا کیوں نہیں خریدتے؟"

میں کچھ دیر سوچتا رہا۔

یوں تو میں اپنے کوٹ کے لئے کپڑا خریدنا گناہ خیال کرتا تھا۔ مگر شمی کی آنکھیں..... ان آنکھوں کو تکلیف سے بچانے کے لئے میں منگل سنگھ تو کیا تمام دنیا سے جنگ کرنے پہ آمادہ ہو جاؤں۔ ورسٹڈ کے تھانوں کے تھان خریدلوں نئے گرم کوٹ کے لئے کپڑا

خریدنے کا خیال دل میں پیدا ہوا ہی تھا کہ پشپا منی بھاگتی ہوئی کہیں سے آگئی، آتے ہی برآمدے میں ناچنے اور گانے لگی۔ اس کی حرکات کتھاکلی مدرا سے زیادہ کیف انگیز تھیں۔

مجھے دیکھتے ہوئے پشپا منی نے اپنا ناچ اور گانا ختم کر دیا۔ بولی:

"بابو جی..... آپ آگئے؟ ___ آج بڑی بہن جی (راستانی) نے کہا تھا۔ میز پوش کے لئے دوسُوتی لانا اور گرم کپڑے پر کاٹ سکھائی جائے گی۔ گنیا ماپ کے لئے اور گرم کپڑا....."

چونکہ اس وقت میرے گرم کوٹ خریدنے کی بات ہو رہی تھی۔ شمی نے زور سے ایک چپت اس کے منہ پر لگائی اور بولی:

"اس جنم جلی کو ہر وقت....... ہر وقت کچھ نہ کچھ خریدنا ہی ہوتا ہے...... مشکل سے انہیں کوٹ سلوانے پر راضی کر رہی ہوں....."

___ وہ پشپا منی کا رونا اور میرا نیا کوٹ!

میں نے خلافِ عادت اونچی آواز سے کہا: "شمی!"

شمی کانپ گئی۔ میں نے غصے سے آنکھیں لال کرتے ہوئے کہا: "میرے اس کوٹ کی مرمت کر دو....... ابھی..... کسی طرح کرو..... ایسے جیسے دوپٹے کر منگل سنگھ کی گیلی لکڑیاں جلا لیتی ہو...... تمہاری آنکھیں! ہاں! یاد آیا..... دیکھو تو پشپا منی کیسے رو رہی ہے۔ پپی بیٹا! اِدھر آؤ نا..... اِدھر آؤ میری بچی! کیا کہا تھا تم نے؟ بولو تو..... دوسوتی؟ گنیا ماپ کے لئے اور کاٹ سیکھنے کو گرم کپڑا! ___ بچو نھا بھی تو ٹرائسکل کا راگ الاپتا اور غبارے کے لئے مچلتا سو گیا ہو گا۔ اسے غبارہ نہ لے دو گی تو میرا کوٹ بدل جائے گا۔ ہے نا؟..... کتنا رویا ہو گا بے چارہ..... شمی! کہاں ہے؟ بچو؟"

"جی سو رہا ہے ..... " شمی نے سہمے ہوئے جواب دیا۔

" اگر میرے گرم کوٹ کے لئے تم ان معصوموں سے ایسا سلوک کروگی تو مجھے تمہاری آنکھوں کی پرواہی کیا ہے؟" پھر میں نے دل میں کہا، کیا یہ سب کچھ میرے گرم کوٹ کے لئے ہو رہا ہے۔ شمی بچی ہے یا میں بچا ہوں۔ پہلے میں نے کہا ــــ دونوں.... .... مگر جو بچا ہوتا ہے اس کا ہاتھ ہمیشہ اُوپر رہتا ہے۔ میں نے خود ہی دبتے ہوئے کہا:

" تم خود بھی تو اس دن کافوری رنگ کے مینا کار کانٹوں کے لئے کہہ رہی تھیں.... "

" ہاں .... جی .... کہہ تو رہی تھی مگر ...... "

مگر .... مگر اس وقت تو مجھے اپنے گرم کوٹ کی جیب میں دس روپے کا نوٹ ایک بڑا خزانہ معلوم ہو رہا تھا!

دوسرے دن شمی نے میرا کوٹ کہنیوں پر سے رفو کر دیا۔ ایک جگہ جہاں پر سے کپڑا بالکل اڑ گیا تھا۔ صفائی اور احتیاط سے کام لینے کے باوجود سلائی پر بدنما سلوٹیں پڑے گئیں اس وقت معراج الدین ٹیلر ماسٹر کی دکان میرے ذہن میں گھومنے لگی۔ اور یہ میرے تخئیل کی پختہ کاری تھی۔ میرے تخئیل کی پختہ کاری اکثر مجھے مصیبت میں ڈالے رکھتی ہے۔ میں نے دل میں کہا" معراج الدین کی دکان پر ایسے سوٹ بھی تو ہوتے ہیں جن پر سلائی سمیت سو روپے سے بھی زیادہ لاگت آتی ہے ...... میں ایک معمولی کلرک ہوں... ... اس کی دکان میں لٹکے ہوئے سوٹوں کا تصور کرنا عبث ہے .... عبث ......

مجھے فارغ پاکر شمی میرے پاس آ بیٹھی اور ہم دونوں خریدی جانے والی چیزوں کی فہرست بنانے لگے ...... جب ماں باپ اکٹھے ہوتے ہیں تو بچے بھی آ جاتے ہیں ... پشیمانی اور

بچوّ آ گئے ۔ آندھی اور بارش کی طرح شور مچاتے ہوئے ۔

میں نے شمی کو خوش کرنے کے لیے نہیں بلکہ یوں ہی کافوری رنگ کے مینا کار کانٹے رس سے پہلے لکھے ۔ اچانک رسوئی کی طرف میری نظر اٹھی ۔ چولہے میں لکڑیاں مسر مسر جل رہی تھیں ...... اور اِدھر شمی کی آنکھیں بھی دمکتے ہوئے ستاروں کی طرح روشن تھیں ۔ معلوم ہوا کہ منگل سنگھ گیلی لکڑیاں واپس لے گیا ہے ۔

" وہ شہتوت کے ڈنڈے جل رہے ہیں اور کھوکھا " ... شمی نے کہا ۔

" اور اوپلے ؟ "

" جی ہاں ، اوپلے بھی ..... "

" منگل سنگھ دیوتا ہے ...... شاید میں بھی عنقریب گرم کوٹ کے لیے اچھا سا ورسٹڈ خرید لوں تاکہ تمہاری آنکھیں یونہی چمکتی رہیں ۔ انہیں تکلیف نہ ہو ۔۔۔ اس ماہ کی تنخواہ میں تو گنجائش نہیں ...... اگلے ماہ ضرور .... ضرور .... "

" جی ہاں ، جب سردی گذر جائے گی ...... "

پشپا منی نے کئی چیزیں لکھائیں ۔ دو سوتی ، گنیا ماپ کے لئے گرم بلینر سبز رنگ کا ، ایک گز مربع ، ڈی ، ایم ، سی کے گولے ، گوٹے کی مغزی ۔۔۔ اور امرتیاں اور بہت سے گلاب جامن ... منی نے سب کچھ ہی تو لکھوا دیا ۔ مجھے دائمی قبض تھی ۔ میں چاہتا تھا کہ یونانی دواخانہ سے اطریفل زمانی کا ایک ڈبہ بھی لا رکھوں ۔ دودھ کے ساتھ تھوڑا سا کھا کر سو جایا کروں گا مگر منی پشپا نے اس کے لئے گنجائش ہی کہاں رکھی تھی اور جب پشپا منی نے کہا " گلاب جامن " تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا ۔ میں نے کہا سب سے ضروری چیز تو یہی ہے .... شہر سے واپس آنے پر میں گلاب جامن وہاں چھپا دوں گا ، جہاں سیڑھیوں میں بابر جعفر اپنا دودھ کا کلسہ

رکھ دیا کرتا ہے اور پشپا سے کہے گا کہ میں تو لانا ہی بھول گیا تمہارے لئے گلاب جامن!
.....او ہو! ..... اس وقت اس کے منہ میں پانی بھر آئے گا اور گلاب جامن نہ پا کر اس کی عجیب کیفیت ہوگی۔

پھر میں نے سوچا بچو بھی تو صبح سے غبارے اور ٹرائسکل کے لئے ضد کر رہا تھا میں نے ایک مرتبہ اپنے آپ سے سوال کیا "اطریقل زبانی؟" شمی بچو کو پچکارتے ہوئے کہہ رہی تھی " بچو بیٹی کو ٹرائسکل لے دوں گی۔ اگلے مہینے ..... بچو بیٹی سارا دن چلایا کرے گی ٹرائسکل ..... پوپی منا کچھ نہیں لے گا ..... "

بچو چلایا کرے "گی" اور پوپی منا نہیں لے "گا"!

—— اور میں نے شمی کی آنکھوں کی قسم کھائی کہ جب تک ٹرائسکل کے لئے چھ سات روپے جیب میں نہ ہوں میں نیلے گنبد کے بازار سے نہیں گذروں گا۔ اس لئے کہ دام نہ ہونے کی صورت میں نیلے گنبد کے بازار سے گذرنا بہت معیوب ہے۔ خواہ مخواہ اپنے آپ پہ غصہ آئے گا۔ اپنی ذات سے نفرت پیدا ہوگی۔

اس وقت شمی بلیمی آئینے کی بیضوی ٹکڑی کے سامنے اپنے کافوری سپید سوٹ میں کھڑی تھی۔ میں پیچھے سے اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور کہنے لگا "میں بتاؤں تم اس وقت کیا سوچ رہی ہو؟"

"بتاؤ تو جانوں ..... "

"تم کہہ رہی ہو۔ کافوری سپید سوٹ کے ساتھ وہ کافوری رنگ کے میناکار کانٹے پہن کر ضلعدار کی بیوی کے ہاں جاؤں تو دنگ رہ جائے ..... "

"نہیں تو" شمی نے ہنستے ہوئے کہا "آپ میری آنکھوں کے مداح ہوتے تو

کبھی کا گرم......"

میں نے شمی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میری تمام خوشی بے بسی میں بدل گئی۔ میں نے آہستہ سے کہا "او بس......... ادھر دیکھو......... اگلے مہینے..... ضرور خرید لوں گا....."

"جی ہاں، جب سردی....."

— پھر میں اپنی اس حسین دنیا کو، جس کی تخلیق پر محض دس روپے صرف ہوئے تھے، تصور میں بسائے بازار چلا گیا۔

میرے سوا انار کلی سے گذرنے والے ہر ذی عزت آدمی نے گرم سوٹ پہن رکھا تھا۔ لاہور کے ایک جسیم جنٹلمین کی گردن نکٹائی اور ہلکے کالر کے سبب میرے چھوٹے بھائی کے پالتو کتے "ٹائیگر" کی گردن کی طرح اکڑی ہوئی تھی۔ میں نے ان سوٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"لوگ سچ مچ بہت مفلس ہو گئے ہیں...... اس مہینے معلوم کتنا سونا چاندی ہمارے ملک سے باہر چلا گیا ہے۔" کانٹوں کی دکان پر میں نے کئی جوڑیاں کانٹے دیکھے۔ اپنی تخیل کی پختہ کاری سے میں شمی کی کافوری سپید سوٹ میں ملبوس ذہنی تصویر کو کانٹے پہنا کر پسند یا ناپسند کر لیتا..... کافوری سپید سوٹ..... کافوری مینا کار کانٹے...

..... کثرتِ اقسام کے باعث میں ایک بھی منتخب نہ کر سکا۔

اس وقت بازار میں مجھے یزدانی مل گیا۔ وہ تفریح کلب سے جو دراصل پریل کلب تھی، پندرہ روپے جیت کر آیا تھا۔ آج اس کے چہرے پر اگر سرخی اور بشاشت کی لہریں دکھائی دیتی تھیں تو کچھ تعجب کی بات نہ تھی۔ میں ایک ہاتھ سے اپنی جیب کی سلوٹوں کو چھپانے لگا۔

نچلی بائیں جیب پر ایک روپے کے برابر کورٹ سے ملتے ہوئے رنگ کا پیوند بہت ہی نامونوں دکھائی دے رہا تھا...... میں اسے بھی ایک ہاتھ سے چھپاتا رہا۔ پھر میں نے دل میں کہا۔ کیا عجب یزدانی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھنے سے پہلے میری جیب کی سلوٹیں اور وہ روپے کے برابر کورٹ کے رنگ کا پیوند دیکھ لیا ہو...... اس کا بھی ردِعمل شروع ہوا اور میں نے دلیری سے کہا:

"مجھے کیا پروا ہے..... یزدانی مجھے کون سی تھیلی بخش دے گا.... اور اس میں بات ہی کیا ہے۔ یزدانی اور سناسنگھ نے بارہا مجھ سے کہا ہے کہ وہ رفعتِ ذہنی کی زیادہ پروا کرتے ہیں اور ورسٹڈ کی کم۔"

مجھ سے کوئی پوچھے۔ میں ورسٹڈ کی زیادہ پروا کرتا ہوں اور رفعتِ ذہنی کی کم!

یزدانی رخصت ہوا اور جب تک وہ نظر سے اوجھل نہ ہو گیا میں غور سے اس کے کوٹ کے نفیس ورسٹڈ کو پشت کی جانب سے دیکھتا رہا۔

پھر میں نے سوچا کہ سب سے پہلے مجھے پشپامنی کے گلاب جامن اور امرتیاں خریدنی چاہئیں۔ کہیں واپسی پر یہ بھول ہی نہ جاؤں۔ گھر پہنچ کر انہیں چھپانے سے خوب تماشا رہے گا۔ مٹھائی کی دکان پر کھولتے ہوئے روغن میں کچوریاں خوب پھول رہی تھیں۔ میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس طرح جیسے گلاب جامن کے تخیل سے پشپامنی کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ قبض اور اطریفل زمانی کے خیال کے باوجود میں سفید پتھر کی میز پر کہنیاں ٹکا کر بہت رغبت سے کچوریاں کھانے لگا۔

ہاتھ دھونے کے بعد جب پیسوں کے لئے جیب ٹٹولی تو اس میں کچھ بھی نہ تھا۔ دس کا نوٹ کہیں گر گیا تھا!

کوٹ کی اندرونی جیب میں ایک بڑا سوراخ ہو رہا تھا۔ نقلی ریشم کی ڈنڈیاں چاٹ گئی تھیں۔ جیب میں ہاتھ ڈالنے پر اس جگہ جہاں مرانجا' مرانجا اینڈ کمپنی کا لیبل لگا ہوا تھا میرا ہاتھ باہر نکل آیا۔ نوٹ وہیں سے باہر گر گیا ہوگا۔

ایک لمحہ میں یوں دکھائی دینے لگا جیسے کوئی بھولی سی بھیڑ اپنی خوبصورت پشم اُتر جانے پر دکھائی دینے لگتی ہے۔

حلوائی بھانپ گیا۔ خود ہی بولا:

"کوئی بات نہیں بابوجی......پیسے کل آجائیں گے!"

میں کچھ نہ بولا......کچھ بول ہی نہ سکا۔

صرف اظہارِ تشکر کے لئے میں نے حلوائی کی طرف دیکھا۔ حلوائی کے پاس ہی گلاب جامن چاشنی میں ڈوبے پڑے تھے۔ روغن میں پھولتی ہوئی کچوریوں کے دھوئیں میں سے آتشیں سرخ امرتیاں جگر پر داغ لگا رہی تھیں......اور ذہن میں پشپامنی کی دھندلی سی تصویر پھر گئی۔

میں وہاں سے بادامی باغ کی طرف چل دیا اور آدھ پون گھنٹے کے قریب بادامی باغ کی ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس عرصہ میں جنکشن کی طرف سے ایک مال گاڑی آئی۔ اس کے پانچ منٹ بعد ایک شنٹ کرتا ہوا انجن جس میں سے دہکتے ہوئے سرخ کوئلے لائن پر گر رہے تھے ـــــــ مگر اس وقت قریب ہی کی سالٹ ریفائنری میں سے بہت سے مزدور اور ٹائم لگا کر واپس لوٹ رہے تھے......میں لائن کے ساتھ ساتھ دریا کے پل کی طرف چل دیا۔ چاندنی رات میں سردی کے باوجود کالج کے چند منچلے نوجوان کشتی چلا رہے تھے۔

"قدرت نے عجیب سزا دی ہے مجھے۔" میں نے کہا "پشپامنی کے لئے گوٹے کی منزی

دوسوتی، گلاب جامن اور شمی کے لئے کافوری ہنا کا رکٹ نہ خریدنے سے بڑھکر کیا گناہ سرزد ہو سکتا ہے۔ کس بیرحمی اور بدردی سے میری ایک حسین مگر بہت سستی دنیا برباد کر دی گئی ہے ...... جی تو چاہتا ہے کہ میں بھی قدرت کا ایک شاہکار توڑ پھوڑ کے رکھ دوں۔

مگر پانی میں کشتی ران لڑکا کہہ رہا تھا:

"اس موسم میں تو راوی کا پانی گھٹنے گھٹنے سے زیادہ کہیں نہیں ہوتا۔"

"سارا پانی تو اُوپر سے اپر باری دواب لے لیتی ہے ...... اور یوں بھی آج کل پہاڑوں پر برف نہیں پگھلتی"...... دوسرے نے کہا۔

میں ناچار گھر کی طرف لوٹا اور نہایت بے دلی سے زنجیر ہلائی۔

میری خواہش اور اندازے کے مطابق پتاجی اور بچو تھا بہت دیر ہوئی دہلیز سے اُٹھ کر بستروں میں جا سوتے تھے۔ شمی چولہے کے پاس شہتوت کے نیم جان کوئلوں کو تاپتی ہوئی کئی مرتبہ اونگھی اور کئی مرتبہ چونکی تھی۔ وہ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اس کے سامنے میں نے چور جیب کے اندر ہاتھ ڈالا اور ربیل کے نیچے سے نکال لیا۔ شمی سب کچھ سمجھ گئی۔ وہ کچھ نہ بولی ...... کچھ بول ہی نہ سکی۔

میں نے کوٹ کھونٹی پر لٹکا دیا۔ میرے پاس ہی دیوار کا سہارا لے کر شمی بیٹھ گئی اور ہم دونوں سوئے ہوئے بچوں اور کھونٹی پہ لٹکتے ہوئے گرم کوٹ کو دیکھنے لگے۔

اگر شمی نے میرا انتظار کئے بغیر وہ کافوری سُوٹ بدل دیا ہوتا تو شاید میری حالت اتنی متغیر نہ ہوتی!

پروانی اور سنتا سنگھ تعزیے کلب میں برج کھیل رہے تھے۔ انہوں نے دو دو گھونٹ

پی بھی رکھی تھی۔ مجھ سے بھی پینے کے لئے اصرار کرنے لگے۔ مگر میں نے انکار کر دیا اس لئے کہ میری جیب میں دام نہ تھے۔ رسنا سنگھ نے اپنی طرف سے ایک آدھ گھونٹ زبردستی مجھے بھی پلا دیا۔ شاید اس لئے کہ وہ جان گئے تھے کہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ یا شاید اس لئے کہ وہ رفعت ذہنی کی ورسٹڈ سے زیادہ پروا کرتے تھے۔

اگر میں گھر میں اس دن شمی کو وہی کافوری سفید سوٹ پہنے ہوئے دیکھ کر نہ آتا تو شاید پیریل میں قسمت آزمائی کرنے کو میرا جی بھی نہ چاہتا۔ میں نے کہا۔ کاش! میری جیب میں بھی ایک دو روپے ہوتے۔ کیا عجب تھا کہ میں بہت سے روپے بنا لیتا ـــــ مگر میری جیب میں تو کل پونے چار آنے تھے۔

یزدانی اور رسنا سنگھ نہایت عمدہ ورسٹڈ کے سوٹ پہنے نیک عالم کلب کے سیکرٹری سے جھگڑ رہے تھے۔ نیک عالم کہہ رہا تھا کہ وہ تفریح کلب کو پیریل کلب اور بار بنتے ہوئے کبھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس وقت میں نے ایک مایوس آدمی کے مخصوص انداز میں جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور کہا "بیوی بچوں کے لئے کچھ جوڑنا قدرت کے نزدیک گناہ ہے۔ اس حساب سے پیریل کھیلنے کے لئے تو آپ اپنی گرہ سے دام دے دینے چاہئیں۔ ہی ہی ......غی غی......"

اندرونی کیسہ...... بائیں کھلی جیب...... کوٹ میں پشت کی طرف مجھے کوئی کاغذ سرکتا ہوا معلوم ہوا۔ اسے سرکاتے ہوئے...... میں نے دائیں جیب کے سوراخ کے نزدیک جا نکالا۔

ـــــ وہ دس روپے کا نوٹ تھا جو اس دن اندرونی جیب کی تہہ کے سوراخ میں سے گذر کر کوٹ کے اندر ہی اندر گم ہو گیا تھا۔

اس دن میں نے قدرت سے انتقام لیا۔ میں اس کی خواہش کے مطابق پریل ڈیل نہ کھیلا۔ نوٹ کو مٹھی میں دبائے گھر کی طرف بھاگا۔ اگر اس دن میرا انتظار کئے بغیر شمی نے وہ کافوری سوٹ بدل دیا ہوتا تو میں خوشی سے یوں دیوانہ کبھی نہ ہوتا۔

ہاں، پھر چلنے لگا وہی تخیل کا دور۔ گویا ایک حسین سے حسین دنیا کی تخلیق میں دس روپے سے اوپر ایک دمڑی بھی خرچ نہیں آتی۔ جب میں بہت سی چیزوں کی فہرست بنا رہا تھا شمی نے میرے ہاتھ سے کاغذ چھین کر پرزے پرزے کر دیا اور بولی:

"اتنے قلعے مت بناؤ... پھر نوٹ کو نظر لگ جائے گی"

"شمی ٹھیک کہتی ہے" میں نے سوچتے ہوئے کہا "نہ تخیل اتنا رنگین ہو اور نہ محرومی سے اتنا دکھ پہنچے"

پھر میں نے کہا "ایک بات ہے شمی! مجھے ڈر ہے کہ نوٹ پھر کہیں مجھ سے گم نہ ہو جائے.... تمہاری کھیمو پڑوسن بازار جا رہی ہے اس کے ساتھ جا کر تم یہ سب چیزیں خود ہی خرید لاؤ.... کافوری پنا کا رکلے نٹے.... ڈی، ایم، سی کے گولے، مغزی.... اور دیکھو پُپی منا کے لئے گلاب جامن ضرور لانا.... ضرور...."

شمی نے کھیمو کے ساتھ جانا منظور کر لیا اور اس شام شمی نے کشمیرے کا ایک نہایت عمدہ سوٹ پہنا۔

بچوں کے شور و غوغا سے میری طبیعت بہت گھبراتی ہے۔ مگر اس دن میں دیر تک بچہ ننھے کو اس کی ماں کی غیر حاضری میں بہلاتا رہا۔ وہ رسوئی سے ایندھن کی کوٹھی، غسلخانے نیم چھت پر — سب جگہ اسے ڈھونڈھتا پھرا۔ میں نے اسے پچکارتے ہوئے کہا:

"وہ ٹرائسکل لینے گئی ہے... نہیں جانے دو، ٹرائسکل گندی چیز ہوتی ہے، اخ تھو

"...... غبارہ لائے گی، بی بی! تمہارے لئے، بہت خوبصورت غبارہ ...."

بچو بٹی نے میرے سامنے تھوک دیا۔ بولی "اے .... ای .... گندی"

میں نے کہا "کوئی دیکھے تو ..... کیسا پٹھولی جیسا بیٹا ہے؟"

پشپامنی کو بھی میں نے گود میں لے لیا اور کہا "پوپی منا ..... آج گلاب جامن جی بھر کر کھائے گا نا! ....."

اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ گودی سے اتر پڑی اور بولی "ایسا معلوم ہوتا ہے .... جیسے ایک بڑا سا گلاب جامن کھا رہی ہوں۔"

بچو روتا رہا، پشپامنی کتھا کلی مدرا سے زیادہ حسین ناچ برآمدے میں ناچتی رہی۔

مجھے میرے تخیل کی پرواز سے کون روک سکتا تھا، کہیں میرے تخیل کے قلعے زمین پر نہ آرہیں۔ اسی ڈر سے تو میں نے شمی کو بازار بھیجا تھا۔ میں سوچ رہا تھا! شمی اب گورنمنٹ ہسپتال کے قریب پہنچ چکی ہوگی ..... اب کالج روڈ کی نکڑ پر ہوگی .... اب گندے انجن کے پاس ....

اور ایک نہایت دھیمے انداز سے زنجیر ہلی۔

شمی سچ مچ آگئی تھی۔ دروازے پر۔

شمی اندر آتے ہوئے بولی "جہیں ستے دو روپے کسو سے ادھار لے کر بھی خرچ کر ڈالے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے کہا۔

پھر بچو، پوپی منا اور میں تینوں شمی کے آگے پیچھے گھومنے لگے۔

مگر شمی کے ہاتھ میں ایک بنڈل کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نے میز پر بنڈل کھولا ......

—— وہ میرے کوٹ کے لئے بہت نفیس ورسٹڈ تھا۔
پشپا منی نے کہا "بی بی! میرے گلاب جامن ..... "
شمی نے زور سے ایک چپت اس کے منہ پر لگا دی!

چھوکری کی لُوٹ

بچپن کی بہت سی باتوں کے علاوہ پرساوی رام کو چھوکری کی لُوٹ کی رسم اچھی طرح یاد تھی۔ دو بیاہے ہوئے بھائیوں کا ساری عمر ایک ہی گھر میں رہنا کسی قدر مشکل ہوتا ہے خصوصاً جبکہ ان میں سے ایک تو صبح و شام گھی شکر میں ملا کر کھانا پسند کرے اور دوسرا اپنی قبول صورت بیوی کے سامنے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کے سلسلے کانوں کا کچا بنے۔ لیکن محلہ شہسوانی ٹولہ میں پرساوی کے پتا چمبا رام اور تایا ٹھنڈی رام جگت گرو اپنے باپ دادا کے مکان میں اکٹھے رہتے آئے تھے۔ یہ اکٹھے رہنے کی وجہ ہی تو تھی کہ چمبا رام کا کاروبار اچھا چلتا تھا اور ٹھنڈی رام کو نوکری سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ عورتوں کی گودیاں بھری تھیں اور صحن کو برکت تھی بلکہ وہاں آم کے ایک بڑے درخت کے ساتھ کھرنی کا ایک خوبصورت سا پیڑ اُگ رہا تھا جس کے پتوں سے کھچڑی ہوتی ہوئی گلگمندہ کی بیل بازار میں چھدامی کی دوکان تک پہنچ گئی تھی اور آس پاس کے

گاؤں سے آئے ہوئے لوگوں کو ٹھنڈی میٹھی چھاؤں دیتی تھی۔

پرساد کی کرنی پرساد کی پیدائش کے ڈیڑھ دو سال بعد چمپا رام کال بس ہو گئے بگر جگت گورو جی نے بھاوج کو بیاہ کے جانا اور پرساد کو اپنا بیٹا کہہ کے پہچانا۔ اور تائی اماں بھی تو یوں بری نہ تھیں؛ اسامی اور ساونی کے دو موقعوں کے سوا جب کہ بٹوارہ گھر میں آتا، وہ پرساد کی اماں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتیں۔ کبھی تو یہ گمان ہونے لگتا جیسے دونوں ماں جائی بہنیں ہیں۔ اس اتفاق کی وجہ سے صحن کی برکت جوں کی توں رہی۔ صحن میں چار پانچ برس سے لے کر بیس اکیس برس تک لڑکیاں بیٹھے، بدھائی، بچھوڑے اور دیس ویس کے گیت گاتیں، چرخے کاتتیں، اور سوت کی بڑی بڑی انٹیاں مینڈھیوں کی طرح گوندھ کر بنائی کے لئے جولاہے کے ہاں بھیج دیتیں۔ کبھی کبھی کھلے موسم میں ان کا رت جگا ہوتا تو صحن میں خوب رونق ہو جاتی۔ اس وقت تو پرساد ہی سے بھوکرے کو پٹاریوں میں سے گلگلے، میوے، بادام، برفی وغیرہ کھانے کے لئے مل جاتی۔

پرساد کی بہن رتنی ——— اس کی تائی کی لڑکی، عمر میں پرساد سے گیارہ بارہ برس بڑی تھی۔ رتنی سے عمر کے اس فرق کا پرساد کو بہت گلہ تھا۔ اور گلہ تھا بھی بالکل بجا۔ سچ پوچھو تو رتنی ایک پل بھی اس کے ساتھ نہ کھیلتی تھی۔ البتہ سردیوں میں سوتی ضرور تھی، اور جب تک وہ پرساد کے ساتھ سو کر اس کے بستر کو گرم نہ کر دیتی، پرساد مچلتا رہتا۔

"رتنی آؤ...... آؤ نا رتنی...... دیکھو تو مارے سردی کے سُن ہوا جاتا ہوں۔"

رتنی بہت تنگ ہوتی تو سٹپٹا کر کہتی "رے سو جا، سو جا مونڈی کاٹے...... میں کوئی انگیٹھی تھوڑے سے ہی ہوں۔"

یہ تو ہوئی رات کی بات۔ دن کو رتنی کسی اپنی ہی دھن میں مگن رہتی۔ ہولے ہولے گاتی

.....'میٹھے لاگے وا کے بول'.....

آخر کوئی تو پرساوی کے ساتھ کھیلنے والا چاہیے تھا۔ جب وہ بالکل اکیلا ہوتا تو اسے کچھ کچھ سمجھ آتی کہ کال بس ہو کر سورگ میں چلے جانے کا کیا مطلب ہے۔ وہاں لوگ اکیلے رہتے ہیں لیکن انہیں کوئی بھی تکلیف نہیں ہوتی۔ جب وہ سوچ سوچ کر تھک جاتا تو دوڑا دوڑا ماتا رانی کے جوہڑ پر پہنچ جاتا۔ تمام کپڑے اتار کر کنارے پر رکھ دیتا اور کچھ دور پانی میں جا کر ایک آدھ ڈبکی لگاتا اور بہت اچھی چکنی مٹی نکالتا اور گھر جا کر رتنی کو دیتا۔ تاکہ وہ اسے ایک مُنّا بنا دے۔ بہت خوبصورت، مٹی کا مُنّا' اور پھر وہ تمام دن مُنّے کے ساتھ کھیلتا رہے گا اور اسے تنگ کرنا چھوڑ دے گا۔ رتنی کہتی: "دیکھو پرسو،...... میں تب بناؤں گی تمہارے لئے مُنّا' اگر تم کوٹھا پھاند کر ٹلّو تھنیا کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ آج شام وہ رتنی بہن کو ضرور ملیں۔"

ٹلّو تھنیا کے مکان کی ڈھلوان سی چھت کو رینگ کر چڑھنا کوئی کھیل تھوڑا ہی تھا۔ رتنی خود گھوڑی بن کر پیڑ کی اوٹ دیتی۔ تب کہیں پرساوی منڈیر تک پہنچتا۔ لاکھ آسرا لینے پر بھی اس کی کہنیاں اور گھٹنے چھل جاتے اور اتنی محنت کے بعد جب پرساوی لوٹتا تو دیکھتا کہ رتنی کی بچی نے کوئی منّا ونّا نہیں بنایا اور پھلکاری کی اوڑھنی کو بڑھی جمعدارنی کی طرح منہ پر کھسکائے وہی بالکل فضول اور بے مطلب سا گانا گنگنا رہی ہے...... 'میٹھے لاگے وا کے بول'......

اس وقت پرساوی کی بہت بُری حالت ہوتی۔ وہ چاہتا کہ وہ بھی کال بس ہو جائے۔ مگر کال بس ہونے سے پہلے بہت ہی پھونک کر گزارا آتا ہے۔ ٹہاں کڑکتی ہیں۔ یوں دکھائی دیتا ہے گویا کوئی بڑا سا خوفناک، کالے رنگ کا بھینسا سینگ مارنے کو دوڑا آ رہا ہے

انسان ڈر ڈر کر چیخیں مارتا اور کانپتا ہے۔ پرسادی کو یہ باتیں قطعاً منظور نہ تھیں۔ بیٹھے بٹھائے پل بھر میں کال بس ہو جانا کسی بھاگوان کو ہی ملتا ہے۔ اس وقت وہ روتے ہوئے ماں کے پاس جاتا اور کہتا:

"چندو کے گھر منّا ہوتا ہے...... بیرو کے گھر منّا ہوا ہے ماں..... ہمارے گھر کیوں نہیں ہوا منّا؟...... تم ایسا جتن کرو ماں، ہمارے ہاں بھی ایک منّا تو ہو جائے۔"

پرسادی کی ماں ایک بہت گہرا اور ٹھنڈا سانس لیتی اور چینکتی ہوئی لوہے کے ایک بڑے ہاون دستے میں لال مرچیں کوٹتی جاتی اور نہ جانے اس کے جی میں کیا آتا کہ پرسادی کی طرح بلک بلک کر رونے لگتی۔ پھر ایکا ایکی سب رونا دھونا چھوڑ کر تیزی سے مونڈھے پر اروی کو چھیلنے کے لئے رگڑنا شروع کر دیتی اور جب پرسادی بالکل ضد ہی کئے جاتا تو وہ کہتی:

"پرسو بیٹا! یوں نہیں کہا کرتے اچھے لڑکے...... تمہارے پتا لالا یا کرتے تھے منّا...... وہ اب روٹھ گئے ہیں۔"

"تو پا کو کہئے نا...... وہی لا دیں ہمارے گھر منّا....."

"وہ منّا اپنے ہی گھر لائیں گے...... پگلے کوئی کسی کے گھر منّا نہیں لاتا..... بھاگ جاؤ۔ کھیلو، بہت باتیں کرو گے تو ماروں گی۔ ہاں!"

—— پرسادی کو کیا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ اسے کسی طرح ایک منّا مل جائے۔ الغرض اس بچارے کو تو کوئی مٹی کا منّا بھی بنا کر نہ دیتا تھا۔

کسی برساتی شام کے صاف اور سنہری جھٹ پٹے میں وہ برکت والا صحن ہر نوع دہر عمر کی

لڑکیوں، رنگ رنگیلے چرخوں اور پٹھوں کی ٹوکریوں سے بھرنا شروع ہو جاتا۔ تمام لڑکیاں عمر کے لحاظ سے دو ٹولیوں میں تقسیم ہو کر گگروندہ اور کھرنی کی آڑ میں بیٹھ جاتیں۔ چھوٹی لڑکیوں کی ٹولی علیحدہ کھرنی کے نیچے ہوتی۔ اس لئے کہ بڑی لڑکیوں کا خیال تھا کہ ان کل کی بچیوں کو چنری اوڑھنے کا تو سلیقہ نہیں اور وہ ان کے گانے کو بھی تو نہیں سمجھ سکتیں، صرف منہ اٹھا کر ایک ٹک ان کی طرف دیکھنے لگ جاتی ہیں۔ پھر شرم آنے لگتی ہے۔ منہ لال ہو جاتا ہے۔ گانا گلے میں اٹک جاتا ہے۔ اور پھر ملو کنہیا کے متعلق باتیں کرنے میں انہیں کوئی مزا نہیں آسکتا...... اور وہ تکلے پر سے دھاگے کی لمبی سی تار اٹھاتی ہوئی یکدم رک کر انٹی کے نیچے ٹوکری میں سے بھنے ہوئے دانے اور گڑ کھاتیں۔ تبھی تو وہ سب کی سب گرم تھیں۔ رنی کی طرح...... اور ان کے چھوٹے بھائی ان کے ساتھ سخت سردی میں سونے کے لئے مچلتے تھے۔

رام کلی وہ سخنہ کہتی اور دوسری کوئی راگ الاپ کر اپنا سر گگروندہ میں چھپا لیتی۔ تیسری املی کہتی ہوئی بیل سے لپٹ جاتی اور جب آم پر کوئل کو کو کرتی تو دھیرا کہتی، ہائے ہائے...... جانے بڑا ہی دکھ پہنچ رہا ہو۔

اسی لئے تو وہ چھوٹی لڑکیوں سے کٹ کر الگ بیٹھتی تھیں۔ پرسادی نے چھوٹی لڑکیوں کو اس قسم کا دکھ پہنچتے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ تو چپ چاپ کھرنی کے نیچے بیٹھ کر پہیلیاں کہتیں۔ انہیں اور خود پرسادی کو وہی سیدھی سادی پہیلیاں بہت پیاری تھیں۔ اس لئے کہ ان کی اپنی زندگی بھی ایک سادہ سی پہیلی تھی۔ ان پر وہ راز نہیں کھلا تھا جو رام کلی، رنی، کھیمو، دھیرا اور مقابلتاً بڑی لڑکیوں پر آشکارا ہو گیا تھا۔

ہاں! ایک بات پرسادی نے بہت محسوس کی۔ وہ یہ تھی کہ گگروندہ کی اوٹ میں بیٹھنے والی

بڑی لڑکیوں میں آئے دن تبدیلی ہوتی رہتی۔ اور جیسے بھری دنیا میں دائیں یا بائیں سے کبھی کبھی آواز آتی ہے کہ فلاں کال بس ہو گیا۔ اسی طرح ان میں سے آواز آتی:

" چمپو بھی بیاہی گئی .... "

یا ___

" رام کلی بھی گئی ...... چلو چھٹی ہوئی ..... پرماتما کرے اپنے گھر بیٹھی لاکھوں برس سہاگ منائے ..... لاکھوں برس "

اور پھر ___

" بہن! دھیرا کے بغیر تو گٹے کا مزا ہی نہیں آتا۔ کیسی ٹھنک کے ساتھ کہتی تھی دوا بن سب جگ لاگے پھیکا، کتنی سندر تھی۔ جب ناک میں تیلی ڈالتی تو یوں ہی دکھائی دیتی جیسے گہنوں سے لدی ہو "

اور پھر ایک اور بول اٹھتی ___ " دھیرا بہت گڑ کھاتی تھی ..... کہتے ہیں بہت گڑ کھانا اولاد کے لئے اچھا نہیں ہوتا "

___ تو کیا گمر وندہ کے نیچے بیٹھی ہوئی ٹولی میں کمی واقع ہو جاتی؟ بالکل نہیں کیونکہ چمپو رام کلی اور دھیرا کی مانند سہاگ منانے کے لئے چلی جانے والی لڑکیوں کی جگہ کھرنی کے نیچے پہیلیاں کہتی سنتی ہوئی لڑکیاں آہستہ آہستہ پر کر دیتیں اور کھرنی کے نیچے بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی خالی جگہ کو پر کرنے کے لئے محلہ شہسوانی ٹولہ کی مائیں کثرت سے چھوکریاں جنتیں اور یوں سلسلہ بندھا رہتا۔ یا شاید یہ سب کچھ اس لئے ہوتا کہ جگت گدو جی کے صحن میں وہ ریل پیل، وہ گہما گہمی ہمیشہ ہمیشہ بنی رہے۔

گھر اور پودھے کے دن تھے۔ جب کرسنکرانت آئی اور عورتیں ڈھکے ہوئے پھل پھولوں کا تبادلہ

کرنے لگیں اور ایک دوسری کے سہاگ کو عرصہ تک قائم رہنے کی دعائیں دینے لگیں۔ کنواری کو کلاؤں نے بھی آنے والی خوشی کی زندگی کی پیش قدمی میں ایک دوسری کے شگن منائے۔ گھر کے مردان عورتوں کی آزادی میں مخل ہونے سے ڈرتے ہوئے اپنی اپنی گڑگڑی وغیرہ اٹھا کر ٹھاکر دوارے چلے گئے ...... پرسادی کی نانی اماں ان دنوں بہت فکر مند رہتی تھیں۔ کہتی تھیں: "میں چھوکری کے ہاتھ پیلے کروں تو اپنی نیند سوؤں۔ ابھی تک بر نہیں ملا.... یہ سنجوگ کی بات ہے نا..... پرماتما ہی کرن ہار ہے.... استری مرد کا وہیں میل ملاتا ہے ...... جہاں سنجوگ ہوں گے ...... ہے پرماتما ....!"

اس روز تمام عورتیں برآمدے میں بیٹھی ٹھٹھے اور ہنسی مذاق کی باتیں کر رہی تھیں۔ ایکا ایکی پرسادی کی نانی اماں نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"لو بیٹی ...... تیار ہو جاؤ سب ...... اب میں اپنی چھوکری کی لوٹ مچاؤں گی ......"

—— اس تہوار میں یہ رسم بھی عجیب ہوتی ہے۔ جس کی لڑکی بہت جوان اور شادی کے قابل ہو جائے وہ اس کی لوٹ مچاتی ہے۔ نانی اماں کی طرح کوئی بوڑھی سہاگن اٹھ کر گری، چھوہارے، بیر اور قسم قسم کی پھل پھلاری لڑکی کے سر پر سے مٹھیاں بھر بھر کر گراتی ہے۔ جب وہ چیزیں نیچے بکھر جاتی ہیں تو تمام کنواری کو کلائیں اور سہاگنیں پھل پھولوں کو لوٹنے کے لئے جگت گرو جی کے صحن میں اُگے ہوئے پیڑوں اور بیل کے پتوں کے طرح کھچڑی ہو جاتی ہیں۔ ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ پھل کھائے۔ اگر سہاگن کھائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اس کے سہاگ کی عمر لمبی ہو جاتی ہے —— شاید لاکھ برس تک! بانجھ کھائے تو اس کے چاند سا بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ کنواری کھائے تو اس کی عنقریب ہی شادی ہو جاتی ہے۔ اچھا سا بر مل جاتا ہے۔ اسی لئے تو کنواری لڑکیاں اٹھا کر چپکے چپکے اور چوری چوری وہ پھل کھاتی ہیں۔

پرسادی نے دیکھا۔ رتنی آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ پرسادی کی ماں نے اسے بتایا کہ چھوکری کی لوٹ کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ تمہاری رتنی بہن کو کوئی بیاہ کر لے جائے گا ۔۔۔ کوئی لوٹ کر لے جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پرسادی کی اماں ہنسنے لگیں "تائی اماں خود بھی تو اپنی چھوکری کے لٹ جانے کو پسند کرتی ہیں اور ایسے آدمی کی متلاشی ہیں جو کہ اسے سر سے پاؤں تک اپنی ہی ملکیت بنا کر ڈولی میں بٹھا چل دے اور بڑے شور و غوغا کے ساتھ۔ ۔ ۔ باجے بجاتا ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر گھر میں آدھی جائداد سمیٹ کر لے جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

پرسادی نے سوچا۔ کسی کو کیا، مصیبت تو اسے ہوگی۔ سردیوں میں رتنی چلی جائے گی تو اس کے بستر کو کون گرم کرے گا؟ تائی اماں تو برف کی طرح ٹھنڈی ہیں اور اماں تو تمام رات کھانستی رہتی ہیں۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پہلو بدلتی اور چھت کی کڑیاں گنتی چلی جاتی ہیں۔ نہ آپ سوتی ہیں، نہ سونے دیتی ہیں۔ کہتی ہیں میرے ساتھ سونا اچھا نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے دق ہے!

تایا جگت گورو ٹھنڈی رام بہت کاریگر تھے۔ تبھی تو لوگ انہیں جگت گورو کہتے تھے۔ صبح شہر میں بھیجنے کے لئے کیلنڈروں کی چٹھیاں بناتے رہے۔ آٹھ بجے کے اندر اندر گھوڑے میں گجریلا تیار کر لیا اور پھر جھٹ سے کام پر بھی چلے گئے۔ بلا کے آدمی تھے جگت گورو۔ اس دن پرسادی بھی ان کے ساتھ کام پر گیا۔

جگت گورو چنگی محصول پر محرر تھے۔ تمام دن وہ گلقند میں استعمال ہونے والے گلاب کے پھولوں اور خام کھالوں پر محصول لگاتے رہے۔ کبھی کبھی کسی سے کچھ لے کر اسے یونہی چھوڑ دیتے۔ آخر جگت گورو تھے تو اور رتنی کی لوٹ جو تھی۔ اس طرح دھیلا دھیلا پیسہ پیسہ کر کے ہی تو

کچھ بنتا ہے۔ تبھی تو وہ موٹے ہوتے جا رہے تھے۔ کہتے ہیں رشوت لینے میں انسان موٹا ہوتا ہے اور روح اور ضمیر سوکھ جاتے ہیں۔ لیکن جسم تو دکھائی دیتا ہے۔ روح اور ضمیر کس کو نظر آتی ہے؟

چنگی پر خوشیا اور روفاقی آئے۔ بر تو نہیں اچھال گیا تھا۔ بہت ہی اچھا! اب ملنے کی تاریخ لینی تھی۔ جگت گورو نے لڑکے اور لڑکی کی جنم پتری پنڈت جی کو دکھا کر تاریخ سدھوا لی تھی اور جنم پتریاں جیب میں لئے پھرتے تھے۔ خوشیا اور روفاقی کے پوچھنے پر فوراً تاریخ بتا دی۔ لڑکے کی طرف سے کوئی بیر مدھ آیا تھا۔ سب "بڑے بھاگ بھان کے..... بڑے بھاگ بھان کے....." کہتے ہوئے رخصت ہوئے۔

تائی اماں بڑی بے صبری سے ساہے کا انتظار کرنے لگیں، انہوں نے کئی چاندی کے برتن بنوائے۔ سونے کے جھومر، جڑاؤ نکلیس، گھڑی، چوڑی اور قسم قسم کے زیور تیار کروا لیے۔ آخر اسی بات کے لئے تو تایا نے گلقند میں استعمال ہونے والی گلاب کی گٹھیں وہ دو چار چار آنے لے کر چھوڑ دی تھیں اور خام کھالوں کی گٹھیں وہ دو چار چار روپے لے کر..... بیسیوں گلاس، بڑی کڑاہی، حمام..... ایک بڑا سا پلنگ بھی خریدا تھا تایا نے۔ اس پر پرسادی اور رتنی ایسے چھ سو جائیں۔ پھر کرسی میز، سنگار دان، باجہ، لڑکی کے سوٹ، لڑکے کے کپڑے اور بدائی پر روپے دینے کے لئے شہر کے نوٹ گھر میں سے نئے روپے منگوائے —— اور پرسادی سوچنے لگا۔ کیا یہ سب کچھ لٹا دینے کے لئے ہے؟

پرسادی نے کہا: تایا کچھ اتنے سیانے نہیں دکھائی دیتے۔ مگر روفاقی، خوشیا، بلی رام اور اڑوس پڑوس کے سب آدمی جگت گورو کی واہ وا کر رہے تھے۔ لڑکی کا دان کرنا سو گائے کے دان کے برابر ہوتا ہے۔ تلا دان سے کم پھل نہیں ملتا۔ وہ سب کہتے تھے، یہی جگت گورو

کو یہ نام جدی لمحوں سے ہی ملا ہے۔ اسی لئے تو یہ نام دیا ہے۔ بڑے سیانے، بڑے کاریگر آدمی ہیں۔ ایشور کسی کو بیٹی دے تو ٹالنے کے لئے اتنا دھن بھی دے۔۔۔۔ واہ وا۔۔۔۔۔ واہ وا۔۔۔۔۔

پرسادی نے اماں سے تایا کی غفلت کے متعلق پوچھا تو وہ کہنے لگی۔ بیٹا! یہ چھوکری کی لوٹ آج سے نہیں۔ جب سے دنیا بنی ہے چلی آ رہی ہے۔ سب اپنی اپنی بیٹیوں کو یوں دے دیتے ہیں۔ اتنی دولت اور دھن بھی۔۔۔ ہائے! اس پر بھی بس ہو تو کوئی لاکھ منائے۔ بیٹیوں والے منتیں کرتے ہیں۔ پاؤں پڑتے ہیں۔ کیا جانے اس کے سسرال روٹھ جائیں۔ تب جا کر ساری عمر کے لئے کوئی کسی کی بیٹی لیتا ہے۔ کوئی بہت بے ڈھب ہو تو لے دے کر بھی نہیں بساتا۔۔۔۔۔۔۔ اور پھر کسی نصیبوں جلی کا بنا بنایا سہاگ اجڑ جاتا ہے۔۔۔۔۔

اور پرسادی کی ماں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وہ بولیں:

"پرسو! تم بھی بڑا ہو گا تو ایک چھوکری لوٹ کر لائے گا۔ اسی طرح جو تن دولت سمیت۔۔۔۔۔۔ ایشور تیری عمر چار جگ لمبی کرے!۔۔۔۔۔ اسے اچھی طرح بسانا۔ مجھے نسچہ ہے میں وہ بھاگ ان سمے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکوں گی۔"

اور پرسادی کی ماں رونے لگیں۔ پرسادی نے پوچھا: "تو تو کہاں چلی جائے گی ماں؟"

وہ اپنی آواز کو دبلتے ہوئے بولیں:

"تمہارے پتا کے پاس۔۔۔۔۔ وہ بھی مجھے اسی طرح لوٹ کر لائے تھے ہیں انھی کی ہوں۔"

—— پرسادی سجھے ہوئے تنور میں ٹانگیں لٹکائے تمام دن اداس بیٹھا سوچتا رہا۔ میں بڑا ہوں گا اور ایک چھوکری کو لوٹ لاؤں گا۔ اس لڑکی کے گھر گلوندہ کی بیل کے نیچے

ایک لڑکی کی کمی ہو جائے گی جیسے کوئی اور نہ پڑھ کرے گی۔ ہاں! وہ بھی تو اپنے کسی بھائی کو سردیوں میں، اپنے بستر میں جم جانے یا نانی اماں کے برف سے ٹھنڈے جسم کے ساتھ لگ کر سو جانے کے لئے چھوڑ آئے گی۔ اس کا بھائی تو رہ رہ کر مجھے گالیاں دے گا اور کہے گا اس سے تو کہیں اچھا ہے کہ میں کال بس ہو جاؤں۔

ساہے کے دن پرسادی کے چچا بہت سے آدمیوں کے ساتھ آئے۔ اگر اماں نہ روکتیں تو پرسادی لٹھ لے کر سب کا مقابلہ کرتا۔ پھر کسی کی کیا مجال تھی کہ رنی کو اتنی لمبی دوری سے لوٹ لے جانے کی جرأت کرتا۔ اگرچہ جگت گورو اور نانی اماں کی اس لوٹ میں خوشی تھی۔ نانی اماں منڈپ کے نیچے جھنڈیوں اور لکڑی کی چڑیوں کے نیچے بیٹھی تھی۔ ارد گرد عورتیں گا رہی تھیں۔ باہر باجا بج رہا تھا اور پنڈت جی کے شلوکوں کی آواز اس شور و غوغا سے علیحدہ سنی جا سکتی تھی۔ جب پھیرے ہو گئے تو سب نے نانی اماں اور جگت گورو کو بدھائی دی۔ نانی اماں کی سُرخ پھلکاری اور جگت گورو جی کی گلابی پگڑی پر کیسر کے نشان لگائے گئے اور پیلے پیلے پھول اور پنکھڑیاں برسائی گئیں۔ جانے انہوں نے رنی کو لٹا کر بہت عقلمندی دکھائی۔ نانی اماں نے سبکدوشی کے ایک احساس سے اس کی لوٹ کی خوشی میں دودھ کے دو بڑے کٹورے بھر کر پیے۔

پرسادی کو چچا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ پرسادی نے کہا: یہ مردہ سا، کالا کلوٹا آدمی رنی بہن کو لوٹ کر لے جائے گا۔ رنی تو اس کی شکل دیکھ غش کھا جائے گی۔ لوٹ کر لے جانے والے ڈاکو ہی تو ہوتے ہیں، بڑی بڑی اور ڈراؤنی شکل کے...... اس میں اور ان میں اتنا فرق ہے کہ ڈاکو منڈاسا باندھ کر آتے ہیں اور یہ کالا کلوٹا چچا سہرا باندھ کر آیا ہے۔

جب کہاروں نے ڈولی اٹھائی تو گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ آج پھر گھروندے کے نیچے ایک

نشرت خالی ہو رہی تھی۔ تائی اماں اونچے اونچے رونے لگیں۔ ہائے! بیٹی کا دھن عجیب ہے
پیدا ہوئی، راتیں جاگی، مصیبتیں سہیں، گو موت سے نکالا۔ پالا، پڑھایا، جوان کیا۔ اب یوں جا
رہی ہے جیسے میں اس کی کچھ ہوتی ہی نہیں۔ ایشور! بیٹی کسی کی کوکھ میں نہ پڑے۔ اس کے
وداع ہونے کا دُکھ بُرا...... ہائے! اس طرح تو کوئی آنکھیں نہیں پھیرتا۔ جگت گورو پرسادی
کی طرح بلکنے لگے۔ اماں تو در و دیوار سے ٹکریں مارنے لگیں۔ ہائے! مجھ سے تو رتنی کا بچھوڑا
سہا جائے گا۔ میری بیٹی نے تو مجھے دوہاگ کا بُلا دیا تھا...... ہائے! اس سنسار کی ریت
جھوٹی، اس سے پریت جھوٹی..... جا..... بیٹی جا..... جا اپنے گھر سُکھی رہ۔ تیری مہک
ہمیں یہاں آتی رہے۔ تو لاکھوں برس سہاگ منائے۔

تمام لڑکیاں بچھڑتا گھٹتے ہوئے رُک رُک گئیں۔

ڈولی کا پردہ اُٹھا کر رتنی نے پرسادی کو گلے سے لگا کر خوب بھینچا۔ پرسادی بھی اسے روتا
دیکھ کر خوب رویا۔ رتنی کہتی تھی "میرے سوبھیا ——— میرے لال! تو میرے بغیر رہتا ہی نہیں تھا۔
اب تو رتنی کو کہاں ڈھونڈے گا؟"

پھر سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگی:

"مجھے اس گھر میں رکھنے کی کوئی بھی حامی نہیں بھرتا۔ سبھی تو میری جان کے لاگو ہو رہے
ہیں۔"

اور جب جیتے جاگتے آدمیوں میں سے کسی نے اسے نہ ٹھہرایا تو رتنی دادا، پچھا رام
چچا کو یاد کر کے رونے لگی۔ در و دیوار سے باتیں کرنے لگی..... میرے بابل کے گھر کے
دوار..... یہ محل........ یہ ماڑیاں، میں سمجھتی تھی میرا اپنا گھر ہے۔ کھڑکی..... او میرے
میٹھے آم..... زروئی پتا: تیرے بسنے مندروں میں سے مجھے زبردستی نکالا کرے جا

رہے ہیں ...... یہاں کا دانہ پانی چھوٹ گیا!"

جب رتنی چلی گئی تو پرساری اسی بجھے ہوئے تنور پر اُداس خاطر بیٹھا اُدھیڑبُن کرتا رہا۔ طرح طرح کے خیال اور وسوسے اس کے دل میں آئے۔ اس نے کہا۔ تائی اور اماں کے خیال کے مطابق جب پرماتما ہی مرد اور استری کا میل ملاتا ہے تو پھر خوشیا اور وفاقی کی کیا ضرورت ہے؟ وہ یوں بھی تو گھر میں سے بیروں اناج اگڑا دھ گھی لے جاتے ہیں۔ گٹھوں کے گٹھے گنوں کے..... ساگ پات، پکا، کچا ——— بدماس کہیں کے ..... صرف اتنی سی بات کہتے ہیں "بڑے بھاگ جگانی کے ..... بڑے بھاگ جگانی کے" اور لا دیتے ہیں اپنا مردہ سا کالا کلوٹا جیجا ——— پرماتما کے کیتے میں دخل دیتے ہیں نا۔ کیوں نہیں ٹلو کنہیا رتنی کو لے جاتے۔ پرماتما نے آپ ہی تو میل ملا دیا تھا اور رتنی بھی تو یہی کہتی تھی کہ تمہارا جیجا ٹلو کنہیا ہے، کبھی کسی کے دو دو جیجے بھی ہوتے ہیں۔ میں تو ٹلو کنہیا ہی کو جیجا کہوں گا۔ اس مردے کو کبھی نہیں۔ لاکھ نعد کرے کوئی۔

نہ جانے یہ لوگ چھوکری کی لوٹ سے اتنے خواہشمند کیوں ہوتے ہیں۔ پل پل گن کر سیاہے کا انتظار کرتے ہیں۔ پھر دل کے بھندوں کے کٹورے پیتے اور بدھائیاں لیتے ہیں! اور پھر جب لوٹ ہوتی ہے تو روتے ہیں۔ اتنا مورکھ کون ہوگا جو آپ ہی سب کام کاج کرے اور پھر روئے۔ جانے کوئی کال بس ہو گیا ہو۔ اور پھر رتنی کی بھی تو جانے کی مرضی نہ تھی۔ وہ دہلیز پکڑ پکڑ کر رو رہی تھی۔ بچاری کا بُرا حال تھا۔

سب گھر لٹا دیا اور پھر ہاتھ جوڑتے رہے۔ قبول کرو۔ میں تو یوں کبھی کسی کے پاؤں نہ پڑوں۔ اوّل تو دوں ہی نہیں۔ دوں تو یوں پاؤں پڑ کر منتیں کر کے کبھی نہ دوں۔ نہ لیں تو جائیں بھاڑ میں!

اس دن پرسادی ساری رات نانی اماں کے برف کے سے ٹھنڈے جسم کے ساتھ لگ کر جاگتا رہا۔

کچھ دنوں بعد رتنی آپ ہی آپ آ گئی۔ پرسادی کو اس نے بہت چوما، پیار کیا، گویا وہ اب اپنے ننھے سے بھائی کو چھوڑ کر کہیں نہ جائے گی اور اسے خود بھی چھوکری کی لوٹ پسند نہیں اس رات پرسادی بڑے سکھ اور چین سے رتنی کے ساتھ سویا۔ رتنی ساری رات پیار سے پرسادی کو بھینچتی رہی ـــــ جب صبح سویرے آنکھ کھلی تو رتنی بستر میں نہ تھی۔ پتہ چلا کہ وہی ٹھیکیدار اسے لوٹ کر لے گیا تھا۔

پرسادی کچھ رویا، مگر ماں نے کہا "بیٹا! یہ رسم آج سے نہیں۔ جب سے دنیا بنی ہے چلی آئی ہے۔"

سوچتے ہوئے پرسادی نے کہا "بڑے نخرے کرتی تھی رتنی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ چھوکریاں خود بھی لٹ جانا پسند کرتی ہیں۔ وہ تو اپنے سوتے ہوئے بھائیوں کے جاگنے کا انتظار بھی نہیں کرتیں اور کالے کلوٹے چچا کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں۔"

اس کے بعد جو رتنی آئی تو چھوکری کی لوٹ کے متعلق پرسادی نے اپنا نظریہ بالکل الٹ دیا تھا۔ اس نے کہا: "دراصل یہ لوٹ سب کے لئے اچھی ہوتی ہے۔ نانی اماں، جگت گورو جی اور خود رتنی بھی اسے پسند کرتی ہے۔ اور خاص طور پر اسے بھی اچھی لگتی ہے۔ مُنّا تو آ جاتا ہے۔ رتنی نے اسے چچا کی طرح دبلا پتلا، مگر اپنی طرح کا گورا چٹا مُنّا کھیلنے کو لا دیا تھا ـــ

پرسادی نے ماں کو جلاتے ہوئے کہا:

"بھولی ماں۔۔۔۔ تو عبث کڑھتی رہی۔۔۔ کیا تو نہ لٹی گئی ماں؟"

پان شاپ

بیگم بازار کی منحوس دکان میں ایک دفعہ پھر بیل دار دسوتی کے بھاری پردے لٹکنے لگے۔ "موجد" دافع چنبل دوا" اور جاپانی کھلونوں کی دکان ——— ادوسا کا فیز (جاپان سے متعلق) کے ملازم استعجاب سے ٹھاکر دلال فوٹو گرافر کو اوک بلائی کا ڈارک روم بناتے دیکھ کر اس کے تاریک مستقبل پر آنسو بہانے لگے۔

"ایک ماہ سے زیادہ چوٹ نہ سہے گا... بیچارہ!"

"دکان کیا ہوگی... بازار سے کچھ ہٹ کر ہے نا۔ نظر اُسے سامنے نہیں پاتی اور بس۔"

ایک ماہ، دو اور چار... ٹھاکر دلال وہیں تھا۔ "موجد" دافع چنبل دوا" اور ادوسا کا فیز کے ملازموں نے حیرت سے انگلیاں منہ میں ڈال لیں۔ جب کہ ۱۱۔ اگست کی صبح کو انہوں نے ایک جہازی سائز کا سائن بورڈ اس منحوس دکان پر آویزاں ہوتے ہوئے دیکھا۔

سائز کے سائن بورڈ پر دیو صورت حروف خالص صنعتی انداز سے ناچتے ہوئے انٹرنیشنل فوٹو سٹوڈیو کی شکل اختیار کر رہے تھے۔

اوساکا فیئر کے منتظم صمیم (خان زادہ) نے سیلولائیڈ کی ایک بڑی سی گڑیا کے اندرونی فیتے کو اُس کے اندرونی قلابوں سے احتیاط کے ساتھ باندھ دیا (تاکہ گاہک کو شکایت کا موقعہ نہ ملے) اور پھر نھارو کی دکان پہ۔ آویزاں سائن بورڈ کو دیکھ کر مسکرانے لگا:۔

"انٹر.... نیشنل فوٹو سٹوڈیو!"

نھارو کا کام بیگم بازار۔ اُس کے نواح کے تین محلوں، سامنے کے نشیبی چوک یا چھاؤنی کے ہائی سکول تک محدود ہو گا۔ مگر وہ اپنی دکان کو ایک بین الاقوامی کاروبار سے کم نہیں دیکھنا چاہتا۔ کیا عجب جو اُسے کسی دن پیٹرو گراڈ، ٹمبکٹو، یا ہونولولو سے فوٹو کا مال مہیا کرنے کے آرڈر ملنے لگیں.... بہرحال بین الاقوامی نام رکھنے میں حرج بھی تو کوئی نہیں۔ اس نام سے دکاندار کی فطری رجائیت ٹپکتی ہے۔

مگر افسوس! سودے کی بدعت ترقی پسند ہندوستانی دکاندار کو بیگم بازار کے نواحی تین محلوں، سامنے کے نشیبی چوک، اور چھاؤنی کے ہائی سکول سے دور کیا جانے دے گی وہ ہر جائز و ناجائز طریقہ سے گاہک کو پھنسانے کی کوشش میں کسب کمال کی تو دھجیاں اڑا دیتا ہے۔ گویا اپنے پاؤں میں آپ بیڑیاں ڈالتا ہے۔ اور یوں زیادہ آمدنی کی توقع میں طبعی آمدنی بھی معدوم!—— نھارو کی دُکان پہ اس جہازی قد کے سائن بورڈ کے نیچے ایک المونیم کی پلیٹ پر جدید عینک ساز بھی لکھا تھا۔ ترقی پسند مگر بھولے نھارو نے جدید عینک سازی۔ محض سودے کی بدعت یا نقل میں شروع کی تھی۔ کیونکہ اس کا پڑوسی دکاندار جرابوں کے کارخانے کے ساتھ "ڈیٹا گھر" کا غذ بھی فروخت کرتا تھا۔

۱۱-اگست کی شام کو اوسا کا فیئر کا منتظم صمیم (خان زادہ) اور بخاری کچھ اداس خاطر ہو کر ملے۔ دونوں کی آمدنی کا بیشتر حصّہ تعطیلات گرما یا سرکاری دفاتر کے شملہ کی طرف کوچ کی نذر ہو چکا تھا۔ ان دنوں میں سٹوڈیو کے سامنے پان شاپ پر بہت رونق رہتی تھی۔

پان شاپ کے پہیئے دار تختوں میں کھریا مٹی سے صاف کئے ہوئے شیشے بہت ہی خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔ ایک ہلکی سبز جھلک رکھنے والے شیشے کے پیچھے ایک ہک کے ساتھ ایک نفیس طلائی سیکنڈس گھڑی لٹک رہی تھی۔ اس کے نیچے قانون دیفہ کی کتابیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ شاید کوئی قانون کا بے قانون اور فضول خرچ طالب علم اتنی قیمتی کتابیں کوڑیوں کے مول گروی رکھ کر پیسے لے گیا تھا۔ کتابوں کے پیچھے ایک پرانی سنگر مشین پڑی تھی۔ اسے گروی رکھنے والے کو اتنی ضرورت یا اتنی جلدی تھی کہ اس نے مشین پر سے دھاگہ کی گولی بھی نہ اٹھائی تھی۔

پان شاپ کی ایک کونے میں کانسی اور پیتل کے فلسطینی پیالوں کی شکل کے گلدستے اور لمبی لمبی ٹانگوں والے کلنگ پڑے تھے۔ فرنیچر کی دو قطاروں میں اخروٹ کی لکڑی میں کشمیری تراش کا ایک بڑا سا گنیش بھی پڑا تھا۔ اور دیوار کے ساتھ پان شاپ کا مالک ایک آہنی صندوقچی پر اپنی کہنیاں رکھے ہوئے اپنے کسی گاہک سے باتیں کر رہا تھا۔

دو باوردی سپاہی پان شاپ کے مالک سے اجازت پا کر برآمدے میں پڑے ہوئے سائیکلوں کے نمبر دیکھ رہے تھے۔

"اے۔ ۱۱۷۸۵ ——— نہیں۔"

"اے۔ ۲۲۳۱۲ ——— یہ بھی نہیں۔"

"ایچ۔ ۱۰۴۷۹ ——— یہ بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں چلو۔"

ایک عیسائی لڑکی دو دانہ بیگم بازار میں پان شاپ سے نشیبی چوک اور نشیبی چوک سے پان شاپ کی طرف واپس آئی۔ وہ بار بار غور سے پان شاپ کے اندر دیکھتی۔ اس وقت اس کے دبلے ہوئے شانے پھڑکنے لگتے۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ پان شاپ کے اندر بیٹھے ہوئے دو ایک آدمی چلے جائیں اور سپاہی اپنا کام کر کے رخصت ہوں۔ تاکہ وہ تخلیہ میں آزادانہ اپنا کاروبار کر سکے یا شاید وہ اپنا مال گروی رکھتے ہوئے جھجکتی تھی۔ اگرچہ اس کے پاس گروی رکھنے کے لئے کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ اس کے قدرے عمدگی سے تراشے ہوئے گلابی لب پچکتے دکھائی دیتے تھے اور اس کی بے خواب اور بھاری آنکھیں بے قراری سے پپوٹوں میں حرکت کر رہی تھیں۔ پسینہ سے سفید ململ کا فراک اس کی پشت پر چمٹ گیا تھا۔ اور پشت کی جانب سے اس کی انگیا کے تناؤ کے ریشمی فیتے شانوں پر گول چکر کاٹتے ہوئے صاف دکھائی دے رہے تھے۔

"آج بہت گرمی ہے ــــ توبہ! ــــ شام کو ضرور بارش ہو گی ــــ" اوساکا فیئر کے منتظم نے کانوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

تھارو نے یہ بات نہ سنی اور بہت انہماک سے پان شاپ کے اندر دیکھتا رہا۔ پھر یکایک کانپتے ہوئے اٹھا اور بولا۔

"اس سے تو میں بھوکا مر جانا پسند کرتا ہوں۔"

نسیم نے غور سے پان شاپ کے اندر دیکھا اور بولا۔

"ضرورت مجبور کرتی ہے میرے بھائی۔ ورنہ کوئی خوشی سے تھوڑا ہی۔ ۔ ۔"

لڑکی پان شاپ سے باہر آئی۔ اس کے بشرہ سے صاف عیاں تھا گروی مال پر اس کے اندازے اور ضرورت سے اسے بہت ہی کم روپیہ ملا تھا۔ نہیں تو اطمینان اور خوشی

کی تحریر اس کے چہرے پر ضرور دکھائی دیتی . . . . وہ اپنے پیار خاوند پر اپنا سب کچھ لٹا چکی تھی۔ اب اس کے پاس سنہری بالوں کے سوا گروی رکھنے کے لئے رہا بھی کیا تھا۔ کاش ان حلقہ دار لمبی سنہری زلفوں کی ہندوستان میں کچھ قیمت ہوتی۔

لڑکی نے اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھا کر ایک انگلی کو جڑ سے مسلنا شروع کیا۔ انگلی پر ایک زرد سا حلقہ نظر آ رہا تھا۔ نا معلوم کتنی ضرورت سے مجبور ہو کر اس نے اپنی عزیز ترین چیز، اپنی رومانوی حیات معاشقہ کی آخری نشانی پان شاپ میں گروی رکھ دی تھی۔ اُس نے اپنے روکھے ہاتھ سے اپنی سنہری زلفوں کو نفرت سے پیچھے ہٹا دیا۔ کیونکہ ان کی کوئی قیمت نہ تھی اور پان شاپ کے پہیے دار تختوں میں کھڑیا مٹی سے صاف کئے ہوئے خوبصورت شیشوں میں اس نے اپنے حسین چہرے کے دھندلے عکس کو دیکھا اور رونے لگی . . . . کیونکہ وہ حسن فروش نہ تھی۔

لوہے کی ایک خوردبین نما نال میں تھارو گرس کے چند ہلکے سے محدب شیشے ڈال کر نصف گھنٹہ کے قریب ایک بوڑھے کی آنکھوں کا معائنہ کرتا رہا۔ بوڑھے کے سامنے کچھ دور ایک طاق کے ساتھ اُردو کے حروف تہجی آویزاں تھے۔

تھارو بار بار اس نال کی درز میں کسی نئے اور ہلکے سے محدب شیشے کو رکھ دیتا۔ بوڑھا کہتا۔

"اب، م۔ تمہارے کوٹ سے بھی بڑی دکھائی دیتی ہے۔"

"اب، ظ، سے شعاعیں نکل رہی ہیں۔"

"اب، ع، دھندلی اور پرچھائیں دار نظر آتی ہے۔"

"اب سب حروف دکھائی تو ٹھیک دیتے ہیں ـــــ مگر بہت ہی چھوٹے چھوٹے ...... تمہارے کوٹ کے بٹن سے بھی چھوٹے۔"

وہ بوڑھا کیا جانے کہ اگر کسی محدب شیشے میں سے تمام حروف تبھی اپنے قد و قامت کے دکھائی دینے بھی لگیں۔ تو بھی وہ نتھا رو لال ـــــ "جدید" عینک ساز اور فوٹو گرافر سے ایک دیدہ زیب سیلولائیڈ کا فریم کیا ہوا چشمہ لگوا کر ہمیشہ کے لئے اندھا ہو جائے گا۔

ڈیڑھ گھنٹہ کی "سائنٹیفک" دیکھ بھال کے بعد نتھا رو نے شیشے کا نمبر ایک کاغذ پر لکھا۔ اور عینک بوڑھے کو دے دی۔

بوڑھا ان امیر گاہکوں میں سے نہیں تھا جو تھوڑے پیسوں کی ادائیگی کے لئے بھی یکم کا وعدہ کیا کرتے ہیں۔ پیسے اس کی مٹھی میں تھے۔ نتھا رو لال کے مانگنے پر اس نے چند پسینہ سے شرابور سکے کونٹر پر بکھیر دیئے۔ ان سکوں کو دیکھنے سے گھن آتی تھی۔ نتھا رو نے ایک حریصانہ انداز سے سکے اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لئے اور اپنا ہاتھ پتلون سے پونچھنے لگا۔

نتھا رو نے ایک مغرورانہ انداز سے پان شاپ کی طرف دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر کا شریف آدمی جس کا منہ کان تک تمتما رہا تھا۔ آہستہ آہستہ پان شاپ کے سامنے کی تین سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ نیچے اترتے ہوئے اس نے پان شاپ کے پہیے دار تختوں میں کھڑیا مٹی سے صاف کئے ہوئے خوبصورت شیشوں میں سے اپنے پر شرافت چہرے کے دھندلے عکس کو دیکھا۔ اور غمزدہ ہو گیا ـــــ کیونکہ وہ بدمعاش نہیں تھا۔

"پان شاپ کا مالک چار دن میں بھی اتنا سود جمع نہیں کر سکتا۔ نتھا رو نے اپنی جیب میں سکوں کی کھنکار پیدا کرتے ہوئے کہا۔

پھر بخارو ایک بے سود بے حاصل غرور کے جذبہ کے ساتھ آس پاس کے دکانداروں کی آمدنی کا اندازہ لگانے لگا۔

اس لاحاصل جمع خرچ میں بیگم بازار کے بساطیوں کا کوئی دخل نہ تھا۔ ان کی آمدنی لامحدود تھی۔ اور بخارو کے محدود تخیل سے بہت ہی پرے۔

"ہاں! موجد "دافع جنبل و داد" کے نسخہ کی قیمت زیادہ سے زیادہ دو آنے ہوگی۔ گندھک، رال، سہاگہ، پھٹکڑی ایک حصہ اور نیلا تھوتھا ۱/۲ حصہ اور ایک مخفی چیز جو اس نسخہ کی کامیابی کی کلید ہے اور جس نے اس عطار کو موجد کا خطاب دیا۔ وہ بھی ایک آدھ پیسہ میں آجاتی ہوگی — اس میں وہ کماتا کیا ہے! اورا کا فیر کے منتظم کو کمیشن بٹہ کی بنا پر تھا ہی کیا ہوگا... ہیر کٹنگ سیلون والے فی حجامت چار آنے.... پانچ آنے کما لیتے ہوں گے..." بخارو نے ایک دفعہ پھر چمکتی ہوئی آنکھوں سے پان شاپ کی طرف دیکھا۔

اس کی پتلون کی جیب میں پسینہ سے شرابور سکے اس کی رانوں کو گیلے گیلے لگنے لگے۔

اس وقت اوسا کا فیر کا منتظم آیا۔

ہفتہ بھر اس کی دکان پر سوائے پرچون کے چند گاہکوں کے اور کوئی نہ آیا تھا، دسہرہ شب برات، یا دیوالی میں ابھی اڑھائی تین ماہ باقی تھے۔ کیا اوسا کا کا بڑا آفس اکتوبر تک انتظار کرے گا؟ صمیم (خان زادہ) کا چہرہ قدرے سیاہ ہو گیا تھا۔ اور اس کے گذشتہ ایک ڈیڑھ ہفتہ میں اتنے مضمحل دکھائی دینے کی کوئی خاص وجہ تھی۔

صمیم نے اپنے آپ کو آرام کرسی پر گرا دیا۔ بخارو بولا۔

"یہ پان شاپ کا کام... ہمارے کاموں سے بیک وقت اچھا بھی ہے۔ اور برا بھی۔"

"اچھا کیسے؟"

"آمدنی ـــــ ہم کر کس کے چشمے اور فریم خریدتے ہیں۔ عکس لینے کے لئے منفی پلیٹیں اور مثبت کاغذ لاتے ہیں۔ کبھی کبھی ہمارا نقصان بھی ہو جاتا ہے۔ پان شاپ میں پلے سے کیا خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی میعاد کے بعد لی ہوئی رقم سے نگنی رقم کی چیز چھڑانے نہ آسکے۔ تو سب کچھ اپنا۔۔۔ اور ایک بڑا ساڈکار۔"

"بُرا کیسے؟"

"بُرا؟ بُرا ـــــ اس میں دھوکا کا خطرہ ہے۔ یہ لوگ دوسرے کا مال اپنے پاس گروی رکھتے ہوئے اور بغیر محسوس کئے ہوئے اپنا ضمیر اپنے گاہک کے سامنے گروی رکھ دیتے ہیں۔ اور یہاں سے کبھی کبھی کوئی حسین لڑکی اپنی رومانوی حیات معاشقہ کی عزیز ترین اور آخری نشانی دے کر حسرت کے عالم میں اپنے رونڈے ہاتھ کو ملتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ اگر ہمارے ہاں سنہری زلفوں کی کوئی قیمت ہو۔ تو یہ حریص آدمی ان کو بھی گروی رکھ لیا کریں۔ اگر کسی شریف ادھیڑ عمر کے آدمی کی شرافت بکاؤ ہو۔۔۔ تو یہ لوگ اسے بھی گروی رکھنے سے گریز نہ کریں۔"

اور تھارو مسکرا کر غرور سے سکے اپنی جیب میں اچھالنے لگا۔

دو گھنٹہ سے تھارو نے چند منفی پلیٹیں رنگیلے پانی میں ڈال رکھی تھیں۔ اب وہ ان سے مثبت کاغذ پر عکس اتارنا چاہتا تھا۔ اس نے پانی میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ پانی گرم ہو چکا تھا۔ اور منفی پلیٹوں پر مصالحہ پگھل کر لادہ کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ تھارو کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

وہ کچھ نہ بولا۔۔۔۔ وہ کچھ بول ہی نہ سکا۔

یہ اسے چھ روپے کا نقصان تھا۔ ایک عینک کی بچت سے تین گنا زیادہ نقصان۔

تھاروا ایک انگڑائی لے کر صمیم کے پاس بیٹھ گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے ایک لمحہ میں اس کی سکت اس کے جسم سے کھینچ لی گئی ہو۔ تھارو ٹکٹکی باندھ کر پان شاپ کی طرف دیکھنے لگا۔ شیشے کے پیچھے طلائی سیلنڈرس قانون وقفہ کی کتابوں پہ لٹک رہی تھی۔ ایک کونے میں کانسی اور پیتل کے فلسطینی پیالوں کی شکل کے گلدستے اور لمبی لمبی ٹانگوں والے کلنگ پڑے تھے۔ فرنیچر کی دو قطاروں میں اخروٹ کی لکڑی میں کشمیری تراش کا ایک بڑا سا گنیش بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اور ایک دیوار کے ساتھ پان شاپ کا مالک ایک آہنی سیف پر اپنی کہنیاں رکھے . . .

اوک پلائی کے ڈارک روم میں دم گھٹ جانے پر تھارو نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور پھر مثبت کاغذ پر نقش کو مستقل کرنے والے مرکب کو ہلاتا رہا۔ اس وقت پسینہ اس کی کمر سے ہو کر گھٹنوں کی پشت پر قطرہ بہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔

شاید تھارو اوک پلائی کے ڈارک روم میں پگھل کر اپنی جان دے دیتا اگر صمیم اوسا کا فیئر کو بند کرتے ہوئے ادھر نہ آنکلتا۔ تھارو نے صمیم کی آواز پہ باہر آتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنی قمیص اتاری۔ اس میں سے پسینہ نچوڑا اور قمیص کو پانی کے ایک ٹب میں چھوڑ دیا۔ اور ہانپتے ہوئے بولا۔

"آج کل ایمانداری کے کام میں پڑا ہی کیا ہے؟ . . .

——— اور بین الاقوامی کاروبار کے شائق تھارو نے ایک پھٹی ہوئی بنیان آہستہ آہستہ سر سے نیچے اتار لی۔

پانی کے ٹب میں تھارو کی قمیص کی جیب میں سے کاغذ کا ایک پرزہ نکل کر پانی پر تیرنے

لگا۔اس پر لکھا تھا۔تین آنے کا مرکب دو آنے یونین کا چندہ۔ایک پیسہ کی گنڈیریاں کل سوا پانچ آنے۔

تھارو بولا۔"یہ میری تمام دن کی آمدنی اور خرچ ہے... تم کنوارا دیکھ کر مذاق کرتے ہو... پیارے... محبت کتنی میٹھی چیز ہے۔مگر خالی معدہ میں تو پانی کی سی نعمت بھی جاکر تڑپا دیتی ہے۔"

اوکا سافیئر کا منظم مبہوت بنا تھارو کے غمزدہ چہرے کے ٹیڑھے میڑھے شکنوں کی طرف دیکھتا رہا۔اور بولا...

"تم ٹھیک کہتے ہو بھائی... ایمانداری کے کام میں پڑا ہی کیا ہے... اوساکا سے چھٹی آئی ہے۔اگر چھ ماہ کے اندر نقشہ کیفیت میں آمدنی مد بھاری یا کم از کم خاطر خواہ دکھائی نہ دی۔تو یہ دکان دہلی کے دفتر سے ملحق کر دی جائے گی۔"

چند لمحات کے لئے دونوں خاموش رہے۔پھر تھارو بولا۔

"پان شاپ کا مالک دس سے لے کر ۱۲½ فیصدی تک فریچر پر دبے ہوئے روپوں میں سے کاٹ لیتا ہے۔عام طور پر نیشنل بنک اور رہا نسے کے سونا پہ ایک پیسہ فی روپیہ سود لیتے ہیں۔مگر ادھر دیکھو صمیم۔تصویر کی طرف مت دیکھو۔تمہیں وہ لڑکی یاد ہے نا۔جس نے مجبوری اور حسرت کے عالم میں اپنی عزیز ترین چیز پان شاپ کے مالک کو دے دی تھی... اس کی انگشتری کی قیمت اسی روپے تھی۔"

خان زادہ اچھل پڑا... تھارو بولا۔

"پان شاپ کے مالک نے خود مجھے بتلایا ہے... اس کی قیمت اس نے تیس روپے ڈالی... صرف تیس... میں سچ کہتا ہوں تیس روپے ایک آنہ فی روپیہ سود لگایا

میعاد ۳۱ - اگست تک ہے یکم بھی نہیں۔۔۔۔ اس کے بعد وہ انگوٹھی اسی لٹیرے اور درندے کی ہوگی۔"

ایک چیتھڑے سے کسی تصویر کی پشت کو کبوتروں کی بیٹ سے صاف کرتے ہوئے تھارو بولا۔

"میری جیب میں کچی کوڑی نہیں۔۔۔۔ دکان میں نہ منفی پلیٹیں ہیں نہ مثبت کاغذ۔۔۔ ۲۰۰ بتی کی طاقت کا ایک بلب فیوز ہو گیا ہے۔ میں کام کیسے کر سکتا ہوں؟

خان زادہ نے اوساکا سے آئی ہوئی چٹھی جیب سے نکالی اور شاید دسویں بار اسے پڑھنے لگا کچھ دیر غور و فکر میں غرق رہنے کے بعد تھارو نے تصویر اور چیتھڑے کو میز پر رکھ دیا اور بولا

"بیگم بازار کی منحوس دکان پر اپنی دکھ بھری کہانی کو دہرائے گی۔۔۔ عنقریب ہی خالی ہو جائے گی۔ انٹرنیشنل فوٹو سٹوڈیو کا کام پیٹروگراڈ، ٹمبکٹو یا ہونولولو تک وسیع ہونا تو ایک طرف رہا۔ وہ تو بیگم بازار سے تشیبی چوک تک بھی پہنچنے سے قاصر رہا۔۔۔ اور کیا بھائی۔۔۔ آج کل ایمانداری کے کام میں رکھا ہی کیا ہے۔۔۔"

صمیم نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے تھارو کھڑا تھا۔ تھارو جس کا جسم اور روح دونوں ارتقا پذیر ہو چکے تھے۔

پان شاپ کا مالک اور تھارو مقامی کاٹن مل کے ہڑتالی مزدوروں کا مظاہرہ دیکھ رہے تھے۔ یکایک پان شاپ کے مالک نے تھارو کو اندر لے جا کر ایک چھوٹا سا کاغذ سامنے رکھ دیا۔

تھارو کا چہرہ کان تک تمتما اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں خون کے آنسو اتر آئے۔ ہکلاتے

ہوئے اس نے کہا۔

"دس فیصدی؟ د۔۔۔۔د۔۔۔۔ دس فیصدی تو بہت ہے۔"

"تمہیں یہ خاص رعایت ہے۔۔۔۔ ورنہ بارہ سے کم نہیں۔"

"تم کیمرہ کو فرنیچر میں کیوں گنتے ہو؟"

"اور وہ زیورات میں بھی تو شمار نہیں ہو سکتا۔"

بھارو لال نے پھر ایک دفعہ کاغذ پر نظر ڈالی۔ اور اپنی شعلہ فگن آنکھوں کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"۳۱۔ اگست کو نہیں۔۔۔۔ تم مجھے لوٹنا چاہتے ہو۔۔۔۔ یکم کی شام تک۔ بلو لوگ یکم کو ہی پیسے دیتے ہیں۔"

بات صرف یہ ہے۔ ۳۱۔ اگست کی رات کو میں شملہ جا رہا ہوں۔ ورنہ یکم ہو جاتی تو کیا پرواہ تھی۔۔۔۔ عموماً اس معاملہ میں گاہکوں کی رضامندی ہمیں مطلوب ہوتی ہے۔۔۔۔ مگر یہ"

مقامی کاٹن مل کے ہڑتالی مزدوروں کے ہجوم کو چیرتے ہوئے ایک شخص باہر نکلا۔ انگلی سے پیشانی پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے پان ٹکٹ نکالا۔ بیالیس روپے پان شاپ کے مالک کی میز پر رکھ دیے اور سنگر مشین چھوڑ کر اس تیزی سے بھاگا کہ دھاگہ کی گولی دکان کے اندر گر کر اس کے پیچھے پیچھے گھسٹتی ہوئی دروازے کی ایک درز میں ٹوٹ گئی۔

بھارو نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کاغذ پر دستخط کر دیے۔ پان شاپ کے مالک نے ایک ڈبیہ کو کھولتے اور بند کرتے ہوئے کہا۔

ایک گواہی بھی ڈلوا دو نا۔۔۔۔ خی خی۔۔۔۔ رسمیہ طور پر ضرورت ہوتی ہی ہے نا۔۔۔۔

۔۔۔۔ خی خی۔۔۔۔"

ادسا کا فیئر کے منتظم کو دے آؤ۔

تھارو کے ہاتھ زیادہ کانپنے لگے۔ وہ بھی صمیم کی طرح معمر نظر آنے لگا۔ تھارو دکھاتے ہوئے بولا۔

"مگر میں صمیم کے سامنے روپیہ لینا نہیں چاہتا۔"

پان شاپ کا مالک ڈرامائی انداز سے ہنسنے لگا۔ ہنستے ہوئے اس نے سامنے لٹکتے ہوئے جھومروں کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔

"وہ صمیم کی بیوی کے ہیں۔"

اب تھارو نے جانا کہ کیوں صمیم ایک ہفتہ میں ہی معمر دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے چپکے سے سند پر بھی دستخط کر دیے۔ پان ٹکٹ ہاتھ میں لیا اور کسی دوسرے دکاندار کی گواہی ڈلوا دی۔

پھر وہ پان شاپ کے پہیئے دار تختوں میں نعرہ ٹیا مٹی سے صاف کیے ہوئے خوبصورت شیشوں میں اپنے معمر اور دیانتدار چہرے کے دھندلے عکس کو دیکھتے ہوئے پان شاپ کی سیڑھیوں پر سے اترا۔ اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں ——— کیونکہ وہ ایمان فروش اور بدقماش نہیں تھا۔

۱۲- اگست تک تھارو سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ وہ اس رسّی کی مانند ہو گیا تھا۔ جو جل جانے کے بعد بھی ویسی صورت رکھتی ہے۔ اُسے کسی طرف سے آمدنی کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس پر سکرات کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ جب کہ آدمی مایوس ہو کر آسمان کی طرف سر اٹھا دیتا ہے۔۔۔ ایمان دار کی خدا مدد کرتا ہے۔۔۔ ایمان کی کمائی۔۔۔ ایمان کی کمائی میں برکت۔۔۔ ایمان۔۔۔ لعنت!۔۔۔

اوساکا فیڈر کا منتظم تھارو کے پاس آیا۔ مایوسی کے انداز سے اس نے اپنے آپ کو ایک کرسی پر گرا دیا اور بولا۔

"پان شاپ ۔۔۔۔ میں ایک کیمرہ دکھائی دیتا ہے۔"

تھارو لال نے شرمندہ ہو کر سر اٹھایا اور ایک گہری نظر سے پان شاپ میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں ـــــ دکھائی دیتا ہے ۔۔۔۔ اور جھومروں کی ایک جوڑی بھی ۔۔۔۔"

خان زادے نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "کتنی میعاد ہے؟"

"۳۱-اگست ۔۔۔۔ اور تمہاری؟"

"۳۱-اگست۔"

"کوئی سبیل؟"

"کوئی نہیں ۔۔۔۔ اور تمہاری؟"

"اوں ہوں۔"

اور دونوں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے سر گرا دیا۔

منگل اشٹکا

۱۲ کارتک ـــــ تلسی بیاہ کا تہوار تھا۔ اسی دن نندہ اور وجے کا بیاہ ہوا۔
نندہ کے چہرے کی سپیدی اور سرخی کسی رنگریز کے ناتجربہ کار شاگرد کے سرخ رنگے ہوئے کپڑے کی مانند تھی۔ اور وہ کسی مستور جذبے سے سرتاپا کانپ رہی تھی۔ اگر اس خود فراموشی میں صرف اسے اتنا سا خیال رہتا کہ وہ کہاں کھڑی ہے اور ایسی حالت میں اسے کیا کرنا چاہیے۔ تو وہ آنکھیں جھپکے بغیر ایک مسلسل نظر سے جیوارام پر دہت کی آٹے سے کھینچی ہوئی لکیروں یا خوبصورت وجے کے گورے گورے پاؤں کی طرف نہ دیکھتی اور نہ ہی وہ پھیریاں لیتے ہوئے قدرے سیدھی کھڑی ہو جاتی۔ کیونکہ قد میں وہ کچھ لمبی تھی اور سیدھی کھڑی ہونے سے وہ اپنے شوہر کے شانے سے بھی سر نکالتی تھی۔ بیاہ سے چند روز پہلے اس کی ماں نے اسے پھیری کے موقع پر جھک کر چلنے کی سخت تاکید کی تھی۔ مگر

نندہ تو یہ بھی بھول چکی تھی کہ بیاہ کے وقت اور بیاہ کے بعد جسمانی لحاظ سے ہی نہیں بلکہ ہر لحاظ سے اُسے اپنے شوہر سے نیچا ہو کر رہنا پڑے گا۔

وجے کی حرکات بہت حد تک اس کی دلی کیفیت کی ترجمان تھیں۔ اس کی بیتاب امنگیں آنکھوں کے راستے سے نہایت آوارگی کے ساتھ پل پل کر نندہ کی گوری گوری کلائیوں اور جسم سے جس کا چھریرا پن سات پردوں میں ملبوس ہونے پر بھی دکھائی دے رہا تھا۔ بے محابا لپٹ رہی تھیں۔ کبھی کبھی وجے کسی گہرے خیال کے زیر اثر آنکھیں بند کر لیتا۔ جیسے مستقبل کی تمام مسرتیں سمٹ کر اس موجودہ لمحے میں مرکوز ہو رہی ہوں۔ اور جیوا رام پروہت ان تمام جذبات کو بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پنڈت جیوا رام کے سامنے آج یہ تیسرا جوڑا تھا۔ جسے وہ رشتہ ازدواج میں منسلک کر رہا تھا۔ جیو رام نے بیاہ کا ساتواں منتر پڑھا—— منتر پڑھتے وقت اُسے اپنے دماغ کو استعمال کرنے کی ضرورت کم ہی محسوس ہوتی تھی۔ کیونکہ بچپن ہی میں جب روی شنکر چٹو پادھیائے نے اُسے منتر پڑھائے تو اس نے سب کچھ صحیح طور پر ایسا رٹ لیا تھا کہ تلفظ درست کرنے، لہجہ سلجھانے، آواز کو اونچا نیچا کرنے اور شعر بدلنے کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ یوں بھی یہ فن اُسے ورثہ میں ملا تھا۔ وہ ایک خود بخود حرکت کرنے والی مشین کی مانند باقاعدہ طور پر اور معین جگہ پر —— یعنی منگل، سینچر، گنیش سے منسوب خشک آٹے کے خانوں میں پیسے رکھواتا۔ یا سیندور اور چاول پھنکواتا اور ایسا کرنے میں اُس سے بھول چوک کبھی نہ ہوتی۔

جیسے نو اور دو چار ہوتے ہیں۔ ایسی صحت سے وہ تمام ضروری رسوم سرانجام دیتے ہوئے تخیل میں کہیں کا کہیں پہنچ جاتا۔ اس دن وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ایک اُونچی

پہاڑی پر کھڑا ہے۔ پہاڑی کے دامن میں اُس کو ایک خوبصورت جھیل ــــ اس میں تیرتے ہوئے بجرے، اس کے کنارے پر لہلہاتی ہوئی کھیتیاں اور ساتھ ہی ماہی گیروں اور دہقانوں کے وہ جھونپڑے نظر آرہے تھے جن میں وہ لوگ ایسی مسرت سے سرشار تھے جس پر بادشاہوں کو بھی رشک آئے اور اس سے پرے امراء کے محل جن میں وہ اپنے زر و دولت اور شان و شوکت کے باوجود غریبوں سے بھی زیادہ دکھی تھے۔ جھیل کے مشرقی کناروں پر پانی میں ناگ پھنی اور کنول اُگ رہے تھے اور شیشم کے ایک کمزور سے درخت کے نیچے کوئی تارک الدنیا، سنیاسی ترئی پھونک رہا تھا اور ترئی کی دلکش آواز اُس بات کی یاد دلا رہی تھی۔ جیسے نسلِ انسان ازل سے بھولتی چلی آرہی ہے۔۔۔۔ اور پھر جیوا رام نے ایک گہری اور ٹھنڈی سانس لی۔ اب اس نے دل میں کہا "ان ہاتھوں سے سینکڑوں بیاہ رچے۔ ان ہاتھوں نے سینکڑوں گھر آباد کیے، کئی غمزدوں کا ایک ایک لمحہ انبساط و نشاط میں سمو دیا۔ مگر میں خود ویسے کا ویسا کنوارا، خانہ برباد اور تنہائی کی ختم نہ ہونے والی مصیبت میں گرفتار رہا۔ اس ناگ پھنی اور کنول کی مانند جو پانی میں اُگتے ہیں۔ مگر پانی سے آلودہ نہیں ہوتے۔

اچانک اُسے خیال آیا کہ وہ بیاہ کا آخری منتر ــــ منگل اشٹکا پڑھ رہا ہے اور پھر اشٹکا کا بھی آخری لفظ۔

"ساودہان۔" اُس نے خود کو کہتے ہوئے پایا۔

ساودہان کے لفظ کے ساتھ ہی بیاہ مکمل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہر طرف سے مبارکباد کی آوازیں آنے لگیں اور اس شور و غوغا نے جیوا رام کی توجہ کو اپنی طرف مائل کر لیا۔

"ساودہان" ــــ جیوا رام نے ایک دفعہ پھر کہا اور۔۔۔ تیسرا بیاہ پڑھنے کے بعد

جیو رام پنڈت کچھ تھکن سی محسوس کرنے لگا۔ آمدنی کا لالچ اُسے اتنی محنت پر کم ہی مجبور کیا کرتا تھا۔ جیوا رام نے اپنی بوجھل آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ آنکھوں کے نیچے بھاری بھاری تھیلے زیادہ بھاری اور سیاہ دکھائی دینے لگے۔ تھیلوں کو سکیڑ کر جیو رام نے ایک جمائی لی۔ نندہ کو منہ بسورتے دیکھا۔ کیونکہ وہ اپنے ماں باپ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہی تھی اور وجے کو مسکراتے ہوئے کیونکہ عنقریب وہ شادی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے والا تھا۔ کئی جمائیوں کے درمیان پروہت نے نہایت اختصار سے نندہ اور وجے کو خاوند اور بیوی کے جداگانہ فرائض سے آشنا کیا۔ اس کی تقریر کا لُب لباب یہ تھا کہ وہ آگ، پانی، ہوا، زمین اور آسمان کی گواہی میں ایک کئے جاتے ہیں۔ نندہ کو بتایا گیا کہ وہ ہر لحاظ سے شوہر سے کم رتبہ رکھتی ہے (اگرچہ جسمانی لحاظ سے وہ شوہر سے سر نکالتی ہے ——) وجے سے کہا گیا کہ اُسے چاہیے کہ وہ نندہ کو اپنے گھر کی رانی بنا کر رکھے۔ پھر جیوا رام نے وجے کو خاص طور پر برہمن، استری اور گائے کی حفاظت کرنے کی تلقین کی۔ شوراتری کی کتھا کا ایک حصہ سناتے ہوئے جیوا رام نے کہا۔

. . . وجے تم بھی پنڈت ہو۔ تم خود جانتے ہو گے۔ شکاری جو تیر مارنا چاہتا تھا۔ اسے جانوروں نے اپدیش دیا۔

۱۰ بکریوں کا مارنا برابر ہے	ایک بیل مارنے کے
۱۰۰ آدمیوں کا مارنا برابر ہے	ایک براہمن مارنے کے
۱۰۰ براہمنوں کا مارنا برابر ہے	ایک استری مارنے کے
۱۰۰ استریوں کا مارنا برابر ہے	ایک گربھ وتی (حاملہ) استری مارنے کے
۱۰ گربھ وتی استریوں کا مارنا برابر ہے =	ایک گائے مارنے کے . . . .

اپنا کام نمٹا چکنے کے بعد جیوارام نے وہاں سے جانا چاہا۔ کس لئے؟ تنہائی کی مصیبت میں پھر گرفتار رہونے کے لئے، ویسا ہی برباد، کنوارا اور اچھوتا رہنے کے لئے۔ جیسے سخت بارش کے بعد ناگ پھنی اور کنول بن بھیگے سر اٹھائیں۔ اتنے بیاہ اس کے ہاتھوں سے ہوئے۔ شادیوں کی اس موسلا دھار بارش میں بھی وہ ناگ پھنی کی مانند۔ ۔ ۔

اس وقت جیوارام کے تصور میں نندہ کا نہ بھول سکنے والا چہرہ، صبح کی اداس آوارہ نگاہیں اور کانوں میں براتیوں کا شور و غوغا اور گانے اور ہنسی مذاق کی آوازیں تھیں۔ اس کی جذباتی طبیعت درحقیقت اُسے وہاں سے رخصت ہو جانے پر مجبور کر رہی تھی۔

وہ طبیعت کیسی تھی —— بات یہ تھی کہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہونے کی وجہ سے وہ باجے ڈھولک، گانے، مذاق اور چٹکیوں کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ بیاہ کے موقعہ پر دلہن کے چہرے کا حیا سے رنگ بدلنا، نوشہ کی دزدیدہ نگاہیں، رخصت ہوتے وقت دلہن کا رونا، راگ رنگ، ہنسی اور مذاق اور قہقہے اس کے دل میں ایک ہیجان بپا کر دیتے۔

خصوصاً بیاہ کے گیت سن کر تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگ جاتا اور اپنے شدید کنوارے پن میں اُسے یہ محسوس ہونے لگ جاتا کہ وہ اس تمام شور و غوغا میں ایک ادنیٰ، بے توقیر اور فالتو سی شخصیت ہے۔ اُس کا یہ وہم دیوانگی کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ منگل اشٹکا پڑھنے اور ساودھان کہہ چکنے کے بعد وہ فوراً ایک کونے کی طرف سرکنا شروع کر دیتا۔ جس قدر دلہن والے اور براتی اس کی فوری کنارہ کشی دیکھتے، اُسی قدر اُسے بیٹھنے کے لئے مجبور کرتے۔ نہایت تکریم سے بلاتے۔ مگر جتنا کوئی اصرار کرتا۔ جیوارام کو اتنی ہی زیادہ خفت ہوتی۔

ایک اور بات سے بھی اس کا اس قدر شرمیلا ہونا منسوب کیا جا سکتا تھا۔ شرم سال

میں باتوں باتوں میں جیوارام نے مجھے بتایا کہ اس سال چیت کی پورنماشی کو ہنومان جینتی کے دن وہ چالیسویں سال میں قدم رکھے گا۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ چیت کی پورنماشی کے دن ماروتی دیو یعنی ہنومان جی پیدا ہوئے تھے اور اس دن سے چالیس برس پہلے جیوارام کی پیدائش بھی انہیں ستاروں کے زیر اثر ہوئی ہوگی جس کے باعث اس کا جسم بھی تنومند تھا۔ اور طبیعت میں ہنومان جی کی سی بے چینی اور جوش تھا یعنی وہ ایک جگہ جم کر کم ہی بیٹھ سکتے تھے۔ فقط ایک بات تھی جو ہنومان جی میں نہ تھی اور وہ جیوارام میں تھی۔ اور وہ جیوارام کا شرمیلا پن اور غیر ضروری حجاب تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ہنومان جی کی پیدائش اور پنڈت جیوارام کی پیدائش میں کچھ وقت کا فرق پڑ گیا ہو اور جیوارام دوسری راس میں داخل ہو کر ہنومان جی سے تفریق پیدا کر چکا ہو اور کسی کمزور ستارے نے ہنومان جی کی سی بے باکی اور جرأت کو شرمیلے پن اور عجز ہی میں بدل دیا ہو۔ بہر حال وہ اس وجہ سے بھی شرمیلا تھا کہ برسوں سے اکیلا رہتا آیا تھا۔ عمر کے چالیسویں سال میں قدم رکھتے ہوئے وہ اس خوفناک حد تک کنوارا تھا کہ اگر بیمار پڑ جائے تو کوئی اُسے پانی کو بھی نہ پوچھے۔ چونکہ عورتوں کی بابت وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس لئے ان سے ڈرتا تھا۔ وہ فقط یہ جانتا تھا کہ دنیا میں بہت سے جھگڑوں کی ابتدا عورت سے ہُوا کرتی ہے۔ اس بات کا بھی اُسے علم تھا کہ عورت کی طبیعت (اس کی اپنی طبیعت کی مانند) جذباتی ہوتی ہے۔ مبہم اور شرمیلی —— نامعلوم کس وقت کوئی بات اُسے بُری معلوم ہونے لگے۔ حالانکہ اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ جیوارام بُری بات کے معیار سے ناواقف تھا۔ بیسیوں بار اُس نے جی کڑا کر کے ایسی باتیں کی تھیں جو اس نے پہلے دل میں بُری محسوس کی تھیں۔ مگر کسی عورت نے بُرا نہ مانا۔ اور اب تو اس کی ہمت بڑھتی جاتی تھی۔

بیس برس سے چالیس برس کی عمر کے درمیان اُسے خیال آیا کہ وہ برہم چاریہ آشرم سے گرہست آشرم میں داخل ہو جائے۔ مگر برہم چاری پنڈت کا درجہ سماج میں کتنا اونچا ہوتا ہے اس کا اُسے غرور تھا۔ محض انگشت نمائی کے خوف سے اُس نے اپنے آپ کو روکے رکھا حتیٰ کہ چالیس برس کی عمر کو پہنچنے تک یہ خیال بہت شکستہ ہو گیا تھا۔ کئی تخیل انگیز بیاہوں نے اس کی ہٹ پر کاری ضرب لگائی تھی اور رفتہ رفتہ یہ اُس کے ذہن نشین ہو گیا۔ کہ چلتی پھرتی دنیا میں کسی کو اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ وہ اپنا کام کاج چھوڑ چھاڑ کر انگشت نمائی کے لئے وقت نکال سکے۔ ایسا خیال کرنا تو اپنے ہی من کی مایا ہے۔

گرہست کے قضیوں کا رونا اگرچہ رتنا شہر کے متعدد گرہستیوں سے انفرادی طور پر سنتے سنتے اس کے کان پک چکے تھے۔ پھر بھی کسی ہوشربا بیاہ کے اہتمام پر چند لمحے حیرت میں ڈوبے رہنے کے بعد جیوا رام منہ سے انگلی نکال کر سر کو ایک جھٹکا دیتا۔ جیسے کسی وکیل کو اپنے موکل کے بیان میں کوئی ایسا موافق نکتہ دکھائی دے۔ جس پر تمام مقدمہ گھوم جائے۔ وہ مشکوک انداز سے کہتا۔

"یہاں —— یہ بات۔ بھئی! آخر کچھ تو ہے جو رونے پیٹنے کے باوجود لوگ خوش رہتے ہیں۔ اس کش مکش اور بے قراری میں بھی کچھ لطف ضرور ہے۔ . . ."

مگر جب جیوا رام کے کان میں یہ الفاظ پڑتے کہ جیوا رام چالیس برس کا ہو چکا ہے۔ اور اس نے ابھی استری کا منہ تک نہیں دیکھا۔ تو جیوا رام کو اپنی فوقیت اور عظمت میں شک نہ رہتا۔ ایسی بات سن کر جیوا رام کے خوش آئند تخیل کی بنائی ہوئی بیاہ کی حسین عمارت ملبہ سمیت نیچے آ رہتی اور اسے از سر نو اور زیادہ وسیع اور شاندار بنانے کے لئے ایک ہوشربا بیاہ، اس کی تمام رونق، ازدواجی رشتوں میں منسلک ہونے والے لڑکی اور

لڑکے کی غائبانہ کشش، ان کے والدین کی خوشی، اُسی راگ رنگ، اور ہنگامہ ہاؤ ہو کی ضرورت ہوتی ـــــ اور نندہ اور وجے کا بیاہ پڑھ چکنے کے بعد ایک ایسی تعمیر کے کنگرے جیوارام کے تخیل میں آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔

چند دنوں کے بعد او باش وجے جو گُنا ہی میں رہتا تھا۔ اور دور نزدیک سے جیوارام کا رشتہ دار بھی تھا، آیا۔ اُس کی آنکھوں کے سُرخ ڈورے زیادہ پھول رہے تھے اور ان سے شعلے نکلتے دکھائی دیتے تھے جیسے اس کے اندر کوئی بھٹی جل رہی ہو۔ ہاں! شباب کی بھٹی تھی نا وہ ـــــ

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام

وجے نے کنوئیں کی چرخی کا سہارا لیتے ہوئے جیوارام سے کہا۔

"کہو دادا (بھائی) اتنے اداس کیوں ہو؟"

جیوارام نے اپنی افسردگی کو چھپا لیا اور بولا۔

"دیکھتے کل سے بیمار ہوں۔ بہت لاچار ہوں ... بھائی کو خط لکھا ہے۔ بھاورج کو یہاں بھیج دے۔ مجھے تو یہاں پانی دینے والا بھی کوئی نہیں۔"

"ارے بھاورج ہے ـــــ ایک ہی کہی تم نے ... دھانوں کے دن ہیں۔ آجکل چھٹائی ہی سر دھننی ہوگی۔ بیٹھو کی کمائی انہیں تک تو محدود ہے۔ اور آج کل تو بھادوں چلا گیا۔ ٹھوا اوپر جا رہا ہے۔ ایک پانی برس گیا تو ان کے کوڑی دام نہیں۔"

دور سے نیلو تن آتا دکھائی دیا۔ یہ رتن مجسم شیطان تھا۔ وہ ہمیشہ بے وجہ ہنستا تھا۔ بے موقع ہنسی مذاق کیا کرتا۔ جب لوگ ہنستے تو وہ روتا۔ جب لوگ روتے تو وہ

ہنستا۔ یہ تعریف اولیاء کی ہوتی ہے۔ مگر وہ ولی بھی تو نہ تھا۔ اور یہی بات خطرناک تھی۔

نیل رتن سے ذکر کیا گیا تو وہ بولا۔

"ٹھیک ہے بھادرچ کو غرض پڑی ہے کہ تمہارے ہاں آئے۔ اس کے تین بچے ہیں، تینوں کمسن، تینوں لڑکیاں۔ جن کا تن ڈھانپتے ہی آدھا دن گزر جاتا ہے — بھلا آئے تو ایک ایک کٹوری سے کم دودھ کسی کو کیا دو گے.... کیا کہتے ہو سیر؟.... ایں؟.... میں کہتا ہوں دو ڈھائی سیر سے کم نہ لگے گا۔ ذرا حساب تو لگاؤ.... اور پھر کئی قسم کا خرچ آپڑے گا۔ یوں دبو گے جیسے چوہا بلی کے نیچے دبا ہوتا ہے۔"

پھر اس بات کا رخ خود بخود پلٹ گیا۔ نیل رتن بولا۔

"کیوں وجے —— بیاہ کیسا رہا۔ بیوی تو اچھی ہے نا؟"

جیوا رام نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"بھئی نندہ تو یوں بھی دیوی ہے —— نری دیوی، وہ جہاں بھی جاتی گھر کو سورگ بنا دیتی۔"

"ٹھیک کہتے ہو دادا" وجے نے کنوئیں کی چرخی کا سہارا ہٹاتے ہوئے کہا۔

"گرہست تو سچ مچ سورگ ہوتا ہے.... کیا بتاؤں، نندہ تو سچ مچ نندہ ہی ہے.... میں نے پچھلے جنم میں کوئی اچھے کرم کئے ہوں گے۔ جو مجھے نندہ ملی.... ایشور کرے میرا ایسا سکھ ہر ایک کو نصیب ہو۔"

اس کے بعد وجے نے اپنے آپ بتایا کہ نندہ اس وقت تک کھانا نہیں کھاتی جب تک اُسے نہ کھلالے۔ وہ کہیں باہر چلا جائے تو تمام دن انتظار رہا کرتا ہے.... دیر لگا کر آئے تو اُسے روتا ہوا پاتا ہے۔ شکوے ہوتے ہیں۔ رات کو سونے سے پہلے اُس

کے پاؤں دبا تی ہے وغیرہ وغیرہ۔ شاید یہ خوش ہونے کی بات تھی۔ اس لئے نیل رتن نے افسردہ سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"ایسا ہی ہوتا ہے بیٹا جی —— چند روز —— ذرا ایک دو برس گزرنے دو.... ایک آدھ بچہ ہو جائے گا۔ پھر دیکھنا یہ گرہست کس بھاؤ پڑتا ہے .... کدھر جاتے ہیں وہ چہچہے۔"

"خیر کچھ بھی ہو۔" جیوا رام نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "جس گھر میں زندہ سی بیوی چلی جائے .... وہ گھر تو ...."

پھر نامعلوم جیوا رام کو کیا ہوا۔ فوراً ہی مغموم سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

"وہ زندگی ہماری طرح تو نہیں کہ بیمار پڑ گئے تو کوئی پانی بھی نہ پوچھے۔ بھاوج کو لکھیں تو وہ دھانوں یا بچوں کی وجہ سے نہ آئے۔ اگر آئے تو دو اڑھائی سیر دودھ وغیرہ —— یہی اندازہ تھا نا رتن؟"

وجے اور نیل رتن نے شدید طور پر جیوا رام پنڈت کی مصیبت کو محسوس کیا۔ نیل رتن نے ایک خاص انداز سے وجے کی طرف دیکھا۔ وجے بولا۔

"دادا تم جانتے ہو۔ میں کس لئے تمہارے پاس آیا ہوں؟"

"نہیں —— میں کیا جانوں۔"

"میں تم سے منگل اشٹکا سیکھنے آیا ہوں، باقی کے سات منتر تو مجھے آتے ہیں۔ منگل اشٹکا پڑھتے وقت کچھ روانی نہیں پاتا ہوں۔"

"تم بھی پروہتوں کا کام کرنے لگے .... اپنا کام چھوڑ دیا تم نے؟"

"تمہیں سکھا دینے میں تامل ہی کیا ہے۔ ایک خاص بیاہ پر ضرورت ہے ...."

پھر جیوارام کے قریب آتے ہوئے وجے نے کہا۔

”دادا! بات یہ ہے۔ ہمارے ہاتھ تلے ایک لڑکی ہے . . . نہایت سندر، ذرا چنچل ہے . . . . تمہاری طرح ——— عورتیں ہوتی ہی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں۔ تمہارا اُس سے بیاہ ہو جائے۔ بیاہ میں ہی پڑھ دوں۔ اور زیادہ لاگ لپیٹ اور شور نہ ہو . . . گرہست میں تمہیں بہت سکھ ملے گا۔ تمہاری حالت کا اندازہ میں نے اسی دن لگا لیا تھا۔ جب تم میرا بیاہ پڑھ رہے تھے۔“

وجے اور نیل رتن جیوارام کے اثبات و نفی کا انتظار کرنے لگے۔

چند لمحات کے لئے خاموشی رہی۔

جیوارام کا جواب خاموشی تھا۔ جس کا مطلب تھا۔ نیم رضامندی۔

نیل رتن نے چپکے سے کہا۔

”دادا ——— اچھی بات ہے۔ وجے پنڈت ہی ہے نا۔ وہ منگل اشٹکا دشلوکا پڑھ لے گا۔ بہت شور مچائے بغیر بیاہ ہو جائے گا۔ سکھی رہو گے۔ تم جانو تمہارا کام . . . ہم بھلے کی کہتے ہیں ——— دن مت دیکھو۔ ۲۵۔ کارتک۔ بدھ وار، شبھ لگن، شبھ مہورت، بس منگل اشٹکا اور ساودھان۔“

ناگ پھنی اور کنول کو اپنی پتیاں بھیگتی ہوئی نظر آنے لگیں، جیوارام کی ذہنی تعمیر کے کنگرے آسمان سے باتیں کرتے کرتے بالکل آسمان سے جا ملے۔

جیوارام پروہت کے بیاہ کے لئے بہت ٹھاٹھ باٹھ کیا گیا۔ باجے بھی بجے اور ڈھولک بھی۔ مذاق بھی ہوئے اور قہقہے بھی بلند ہوئے۔ جیوارام کا دل بھی دھڑکا ———

اور بہت زور زور سے۔ فقط اتنی کسر تھی کہ چھاتی کی دیواریں نہ ہوتیں تو کبھی کا اُچک کر باہر آ رہتا۔

وجے نے دیکھا۔ پنڈت جیوارام کی نظریں بھی آوارہ ہو چکی تھیں اور مچل مچل کر اپنی ہونے والی بیوی کی گوری گوری کلائی پر چمکتی ہوئی چوڑیوں اور جسم جس کا چھریرا پن سات کپڑوں میں ملبوس ہونے پر بھی دکھائی دے رہا تھا کا جائزہ لے رہی تھیں اس کی زوجہ نندہ کی طرح لمبی تھی اور اپنے شوہر سے سر نکالتی تھی اور یہ محض اتفاق کی بات تھی۔

وجے نے رسمیہ طور پر عہد کے لئے جیوارام کا ہاتھ اُس کی ہونے والی بیوی کے ہاتھ میں دیا۔ اس پر گیلا آٹا رکھا اور ساتواں منتر پڑھ دیا۔ چاروں طرف سے چاول وجے کے آگے گرنے لگے۔

وجے ایک استادانہ طرز سے پیسے منگل، سنیچر، گنیش، وغیرہ کے خانوں میں رکھوا رہا تھا۔ کانپتے ہوئے جیوارام نے اشارہ سے وجے کو بلایا۔ منتر گنگناتے ہوئے وجے نے اپنا کان جیوارام کے منہ کے پاس کر دیا۔ جیوارام نے کہا۔

"بھیا ——— میرا دل بہت دھڑک رہا ہے۔۔۔ میں کانپ رہا ہوں۔ دیکھتے نہیں مجھے سردی لگ رہی ہے۔ نیل رتن سے کہنا مجھے ذرا تھامے رکھے۔"

وجے برابر منتر گنگناتا گیا۔ وجے کا ایک اور ساتھی بولا۔

"دادا ——— نیل رتن گیر ہٹ گیا ہے۔۔۔ تم جانتے ہو گنتا سے بہت دُور نہیں ہے۔ آتا ہی ہوگا۔"

"وجے ——— ٹھہرو۔" جیوارام نے آہستہ سے کہا۔ "منگل اشٹک ابھی نہ پڑھو۔ مجھے سوچ لینے دو۔ میری عمر چالیس برس کی ہے۔ اور میں برہمچاری پنڈت ہوں۔۔۔"

"وجے نے دیکھا۔جیوارام سچ مچ بیاہ کے لئے بہت مصر تھا۔اس کے گلے میں خشکی پیدا ہو رہی تھی۔لب سوکھ گئے تھے۔جن پر جیوارام دیوانہ وار زبان پھیر رہا تھا۔

وجے نے آہستہ مگر ایک حقارت آمیز آواز سے جیوارام سے کہا۔

"چھی چھی —— تمہارے ایسے کمزور آدمیوں کے لئے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں دادا —— دنیا ایسے لوگوں کا مذاق اڑایا کرتی ہے۔"

جیوارام کے بس کی بات ہوتی تو وہ منگل اشٹکا کا جاپ ہونے سے پہلے ہی اپنے پاک برہمچریہ کو گرہست کی آلودگیوں سے بچانے نکلتا۔مگر اس نے دیکھا کہ اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو اس کی ہونے والی بیوی نے بہت زور سے دبا رکھا تھا۔شاید وہ سوچتی تھی کہ وہ ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں؟ . . . شاید شرارت کے طور پہ چنچل تھی نا —— جوانی تھی نا —— عورت!

پھر جیوارام منگل اشٹکا کے جلدی جلدی پڑھے جانے کا انتظار کرنے لگا تاکہ وہ جلد ہی اس ذہنی کوفت سے نجات حاصل کر لے۔اور اپنی ہونے والی بیوی کا چہرہ دیکھے اس کے تخیل کی مشین چلنے لگی۔پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک دلفریب پہاڑی پہ کھڑا ہے۔پہاڑی کے دامن میں اس کو ایک خوبصورت نیلی جھیل —— اس میں تیرتے ہوئے بجرے،اس کے کنارے پہ لہلہاتی ہوئی کھیتیاں،اور ساتھ ہی ماہی گیروں اور دہقانوں کے وہ جھونپڑے نظر آ رہے تھے۔جن میں وہ لوگ ایسی مسرت سے سرشار تھے جس پر بادشاہوں کو بھی رشک آئے۔اور ان سے پرے امراء کے محل جن میں وہ زر و دولت اور شان و شوکت کے باوجود غریبوں سے بھی زیادہ دکھی تھے۔جھیل کے مشرقی کناروں پر پانی میں ناگ پھنی اور کنول اُگ رہے تھے اور شیشم کے ایک پودے سے درخت کے نیچے

کوئی تارک الدنیا سنیاسی نرسنگھا پھونک رہا تھا۔ اور نرسنگھے کی دلکش آواز اس بات کی یاد دلا رہی تھی۔ جیسے نسلِ انسان ازل سے بھولتی چلی آ رہی ہے . . .

—— فقط اب وہ اکیلا نہ تھا۔ اس کی بیوی بھی اس کے بازو میں بازو ڈالے محوِ نظارہ تھی۔

پانی میں ناگ پھنی اور کنول تر بتر ہو رہے تھے۔

یکایک منگل اشٹکا نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ کتنا خوبصورت پر معنی منتر ہمارے بزرگوں نے . . . .

"ساودھان" کی آواز آئی اور لوگوں نے مبارکباد دی۔

ورجے نے اپدیش دیا۔ بالکل جیوارام کی طرح —— ورجے نے آخر میں کہا۔

۱۰ بکریوں کا مارنا برابر ہے	ایک بیل کے
۱۰۰ آدمیوں کا مارنا برابر ہے	ایک براہمن مارنے کے

پاس ہی سے ایک شرارتی لڑکے نے آہستہ سے کہا۔

ایک من برابر ہے	چالیس سیر کے
ایک سیر برابر ہے	سولہ چھٹانک کے

اور ورجے نے گھورتے ہوئے کہا "ہست۔ ہشت

شام کو حجلۂ عروسی میں جیوارام نے اپنی دلہن کو گٹھڑی بنے ایک کونے میں بیٹھے دیکھا جیوارام کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اپنی بیوی کا منہ دیکھنے کی اس میں جرأت نہ تھی۔

"وہ شاید یہ حرکت اسے بری لگے —— جیوارام نے دل میں کہا۔ "عورت ہے نا . . ."

جیوارام نے جتنی دفعہ کوشش کی۔ اتنی دفعہ ہی ناکام رہا۔ اُسے یہ محسوس ہونے لگا جیسے اُس کے کمرے میں اور بھی بہت سے آدمی ہیں۔ اُسے واہمہ گردانتے ہوئے جیوارام نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ مگر پھر روک لیا۔

"تمہارے ایسی کمزور طبیعت والے آدمی کو تو دنیا آڑے ہاتھوں لیتی ہے ..... چھی چھی —— وجے کے الفاظ جیوارام کے کانوں میں گونجنے لگے۔

جیورام نے جب نہایت ہمت سے کام لے کر آناً فاناً دلہن کا منہ بے نقاب کیا تو دلہن دیوانی ہوکر تالیاں بجانے لگی۔ جیوارام کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اُس نے دیکھا کہ بیاہا ہوتے ہوئے بھی وہ کنوارا تھا۔ یا کنوارا ہوتے ہوئے وہ رنڈوا تھا یا..."

—— دو چارپائی پر دلہن کی بجائے نہایت قیمتی کپڑوں میں ملبوس نیل رتن تالیاں بجا رہا تھا۔ اور باہر سے منگل اشٹدکا کے اونچے اونچے جاپ کے درمیان بے تحاشا قہقہے بلند ہو رہے تھے!!

کوارنٹین

پلیگ اور کوارنٹین :

ہمالہ کے پاؤں میں لیٹے ہوئے میدانوں پر پھیل کر ہر ایک چیز کو دھندلا بنا دینے والی کہر کے مانند پلیگ کے خوف نے چاروں طرف اپنا تسلط جما لیا تھا۔ شہر کا بچہ بچہ اس کا نام سُن کر کانپ جاتا تھا۔

پلیگ تو خوفناک تھی ہی، مگر کوارنٹین اُس سے بھی زیادہ خوفناک تھی۔ لوگ پلیگ سے اتنے ہراساں نہیں تھے جتنے کوارنٹین سے اور یہی وجہ تھی کہ محکمۂ حفظانِ صحت نے شہریوں کو چوہوں سے بچنے کی تلقین کرنے کے لئے جو قدِ آدم اشتہار چھپوا کر دروازوں گزرگاہوں اور شاہراہوں پر لگایا تھا اس پر "نہ چوہا نہ پلیگ" کے عنوان میں اضافہ کرتے ہوئے "نہ چوہا نہ پلیگ، نہ کوارنٹین" لکھا تھا۔

کوارنٹین کے متعلق لوگوں کا خوف بجا تھا۔ بحیثیت ایک ڈاکٹر کے میری رائے نہایت

مستند ہے اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ جتنی اموات شہر میں کوارنٹین سے ہوئیں اتنی پلیگ سے نہ ہوئیں۔ حالانکہ کوارنٹین کوئی بیماری نہیں۔ بلکہ وہ اس وسیع رقبہ کا نام ہے جس میں متعدی وبا کے ایام میں بیمار لوگوں کو تندرست انسانوں سے از روئے قانون علیحدہ کر کے لا ڈالتے ہیں تاکہ بیماری بڑھنے نہ پائے۔ اگرچہ کوارنٹین میں ڈاکٹروں اور نرسوں کا کافی انتظام تھا، پھر بھی مریضوں کے کثرت سے وہاں آجانے پر اُن کی طرف فرداً فرداً توجہ نہ دی جا سکتی تھی۔ خویش و اقارب کے قریب نہ ہونے سے میں نے بہت سے مریضوں کو بے حوصلہ ہوتے دیکھا۔ کئی تو اپنے نواح میں لوگوں کو پے در پے مرتے دیکھ کر مرنے سے پہلے ہی مر گئے۔ بعض اوقات تو ایسا ہوا کہ کوئی معمولی طور پر بیمار آدمی وہاں کی وبائی فضا ہی کے جراثیم سے ہلاک ہو گیا۔ اور کثرتِ اموات کی وجہ سے آخری رسوم بھی کوارنٹین کے مخصوص طریقہ پر ادا ہوتیں یعنی سینکڑوں لاشوں کو مردہ کتوں کی نعشوں کی طرح گھسیٹ کر ایک بڑے ڈھیر کی صورت میں جمع کیا جاتا اور بغیر کسی کے مذہبی رسوم کا احترام کئے پٹرول ڈال کر سب کو نذرِ آتش کر دیا جاتا اور شام کے وقت جب ڈوبتے ہوئے سورج کی آتشیں شفق کے ساتھ بڑے بڑے شعلے یک رنگ و ہم آہنگ ہوتے تو دوسرے مریض یہی سمجھتے کہ تمام دنیا کو آگ لگ رہی ہے۔

کوارنٹین اس لئے بھی زیادہ اموات کا باعث ہوئی کہ بیماری کے آثار نمودار ہوتے تو بیمار کے متعلقین اُسے چھپانے لگتے۔ تاکہ کہیں مریض کو جبراً کوارنٹین میں نہ لے جائیں۔ چونکہ ہر ایک ڈاکٹر کو تنبیہ کی گئی تھی کہ مریض کی خبر پاتے ہی فوراً مطلع کرے۔ اس لئے لوگ ڈاکٹروں سے علاج بھی نہ کرواتے اور کسی گھر کے وبائی ہونے کا صرف اسی وقت پتہ چلتا جب کہ جگر دوز آہ و بکا کے درمیان ایک لاش اُس گھر سے نکلتی۔

ان دنوں میں کوارنٹین میں بطور ایک ڈاکٹر کے کام کر رہا تھا۔ پلیگ کا خوف میرے دل و دماغ پر بھی مسلط تھا۔ شام کو گھر آنے پر میں ایک عرصہ تک کار بالک صابن سے ہاتھ دھوتا رہتا اور جراثیم کش مرکب سے غرارے کرتا۔ یا پیٹ کو جلا دینے والی گرم کافی یا برانڈی پی لیتا۔ اگرچہ اس سے مجھے بے خوابی اور آنکھوں کے چندھے پن کی شکایت پیدا ہو گئی۔ کئی دفعہ بیماری کے خوف سے میں نے قے آور دوائیں کھا کر اپنی طبیعت کو صاف کیا۔ جب نہایت گرم کافی یا برانڈی پینے سے پیٹ میں تبخیر ہوتی اور بخارات اٹھ اٹھ کر دماغ کو جاتے تو میں اکثر ایک حواس باختہ شخص کی مانند طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتا۔ گلے میں ذرا بھی خراش محسوس ہوتی تو میں سمجھتا کہ پلیگ کے نشانات نمودار ہونے والے ہیں ــــ اُف! میں بھی اس موذی بیماری کا شکار ہو جاؤں گا...... پلیگ! اور پھر ــــ کوارنٹین!

انہیں دنوں میں نو عیسائی ولیم بھاگو خاکروب، جو میری گلی میں صفائی کیا کرتا تھا میرے پاس آیا اور بولا "بابو جی ــــ غضب ہو گیا۔ آج ایمبولینس محلہ کے قریب سے بیس اور ایک بیمار لے گئی ہے"

"اکیس؟ ایمبولینس میں...... ؟" میں نے متعجب ہوتے ہوئے یہ الفاظ کہے۔

"جی ہاں...... پورے بیس اور ایک ــــ انہیں بھی کونٹن (کوارنٹین) لے جائیں گے ــــ آہ! وہ بیچارے کبھی واپس نہ آئیں گے؟"

دریافت کرنے پر مجھے علم ہوا کہ بھاگو رات کے تین بجے اٹھتا ہے۔ آدھ پاؤ شراب چڑھا لیتا ہے اور پھر حسب ہدایت کمیٹی کی گلیوں میں اور نالیوں میں چونا بکھیرنا شروع کر دیتا ہے۔ تاکہ جراثیم پھیلنے نہ پائیں۔ بھاگو نے مجھے مطلع کیا کہ اس کے تین بجے اٹھنے کا یہ بھی مطلب ہے کہ بازار میں پڑی ہوئی لاشوں کو اکٹھا کرے اور اس محلہ میں جہاں وہ کام کرتا ہے ان لوگوں کے

چھوٹے موٹے کام کاج کرے جو بیماری کے خوف سے باہر نہیں نکلتے۔ بھاگو تو بیماری سے ذرا بھی نہیں ڈرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر موت آئی ہو تو خواہ وہ کہیں بھی چلا جائے، بچ نہیں سکتا۔

ان دنوں جب کوئی کسی کے پاس نہیں پھٹکتا تھا۔ بھاگو سر اور منہ پر ڈھاٹا سا باندھے نہایت انہماک سے بنی نوع انسان کی خدمت گذاری کر رہا تھا۔ اگرچہ اس کا علم نہایت محدود تھا، تاہم اپنے تجربہ کی بنا پر وہ ایک مقرر کی طرح لوگوں کو بیماری سے بچنے کی ترکیب بتاتا۔ عام صفائی، چونا بکھیرنے اور گھر سے باہر نہ نکلنے کی تلقین کرتا۔ ایک دن میں نے اسے لوگوں کو شراب کثرت سے پینے کی تلقین کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ اس دن جب وہ میرے پاس آیا تو میں نے پوچھا۔ "بھاگو تمہیں پلیگ سے ڈر بھی نہیں لگتا؟"

"نہیں بابوجی ---- بن آئی بال بھی بیکا نہیں ہو گا۔ آپ اتنے بڑے حکیم ٹھہرے، ہزاروں نے آپ کے ہاتھ سے شفا پائی۔ مگر جب میری آئی ہو گی تو آپ کا دارو درمن بھی کچھ اثر نہ کرے گا...... ہاں بابوجی ---- آپ برا نہ مانیں، میں ٹھیک اور صاف صاف کہہ رہا ہوں۔"

اور پھر گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے بولا۔ "کچھ کونٹن کی کہیے بابوجی ---- کونٹن کی!"

"وہاں کوارنٹین میں ہزاروں مریض آ گئے ہیں۔ ہم حتی الوسع ان کا علاج کرتے ہیں۔ مگر کہاں تک، نیز میرے ساتھ کام کرنے والے خود بھی زیادہ دیر ان کے درمیان رہنے سے گھبراتے ہیں۔ خوف سے ان کے گلے اور لب سوکھے رہتے ہیں۔ پھر تمہاری طرح کوئی مریض کے منہ کے ساتھ منہ نہیں جا لگاتا۔ نہ کوئی تمہاری طرح اتنی جان مارتا ہے...... بھاگو خدا تمہارا بھلا کرے جو تم بنی نوع انسان کی اس قدر خدمت کرتے ہو ---!"

بھاگو نے گردن جھکا دی، اور منہ ڈھاٹے سے کے ایک پلو کو منہ پر سے ہٹا کر شراب کے اثر سے سرخ چہرے کو دکھاتے ہوئے بولا۔ "بابوجی! میں کس لائق ہوں۔ مجھ سے کسی کا بھلا ہو جائے میرا

یہ ناتواں تن کسی کے کام آجائے۔ اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے،' باجی بڑے پادری لا بے (ریورینڈ مونٹ ال، آبے) جو ہمارے محلوں میں اکثر پرچار کے لئے آیا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں: خداوند یسوع مسیح یہی سکھاتا ہے کہ بیمار کی مدد میں اپنی جان تک لٹا دو —— میں سمجھتا ہوں ..... "

میں نے بھاگو کی ہمت کو سراہنا چاہا۔ مگر کثرتِ جذبات سے میں رک گیا۔ اس کی خوش اعتقادی اور عملی زندگی کو دیکھ کر میرے دل میں ایک جذبۂ رشک پیدا ہوا۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ آج کوارنٹین میں پوری تن دہی سے کام کر کے بہت سے مریضوں کو بقیدِ حیات رکھنے کی کوشش کروں گا۔ ان کو آرام پہنچانے میں اپنی جان تک لڑا دوں گا۔ مگر کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ کوارنٹین میں پہنچ کر جب میں نے مریضوں کی خوفناک حالت دیکھی اور ان کے منہ سے پیدا شدہ تعفن میرے نتھنوں میں پہنچا تو میری روح لرز گئی اور بھاگو کی تقلید کرنے کی ہمت نہ پڑی۔

تاہم اس دن بھاگو کو ساتھ لے کر میں نے کوارنٹین میں بہت کام کیا۔ جو کام مریض کے زیادہ قریب رہ کر ہو سکتا تھا وہ میں نے بھاگو سے کرایا اور اس نے بلا تامل کیا ..... خود میں مریضوں سے دور دور ہی رہتا۔ اس لئے کہ میں موت سے بہت خائف تھا اور اس سے بھی زیادہ کوارنٹین سے!

مگر کیا بھاگو موت اور کوارنٹین دونوں سے بالاتر تھا؟

اس دن کوارنٹین میں چار سو کے قریب مریض داخل ہوتے اور اڑھائی سو کے لگ بھگ لقمۂ اجل ہو گئے!

یہ بھاگو کی جانبازی کا صدقہ ہی تھا کہ میں نے بہت سے مریضوں کو شفایاب کیا۔ وہ نقشہ

جو مریضوں کی رفتارِ صحت کے متعلق چیف میڈیکل آفیسر کے کمرے میں آویزاں تھا۔ اس میں میرے تحت میں رکھے ہوئے مریضوں کی اوسط صحت کی لکیر سب سے اونچی چڑھتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ میں ہر روز کسی نہ کسی بہانے سے اس کمرہ میں چلا جاتا اور اس لکیر کو سو فی صدی کی طرف اُوپر ہی اُوپر بڑھتے دیکھ کر دل میں بہت خوش ہوتا۔

ایک دن میں نے برانڈی ضرورت سے زیادہ پی لی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ نبض گھوڑے کی طرح دوڑنے لگی اور میں ایک جنونی کی مانند اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ مجھے خود شک ہونے لگا کہ پلیگ کے جراثیم نے مجھ پر آخر کار اپنا اثر کر ہی دیا ہے اور عنقریب ہی گلٹیاں میرے گلے یا بغلوں میں نمودار ہوں گی۔ میں بہت سراسیمہ ہو گیا۔ اس دن میں نے کوارنٹین سے بھاگ جانا چاہا۔ جتنا عرصہ بھی میں وہاں ٹھہرا، خوف سے کانپتا رہا۔ اس دن مجھے بھاگو کو دیکھنے کا صرف دو دفعہ اتفاق ہوا۔

دوپہر کے قریب میں نے اسے ایک مریض سے لپٹے ہوئے دیکھا۔ وہ نہایت پیار سے اس کے ہاتھوں کو تھپک رہا تھا۔ مریض میں جتنی بھی سکت تھی اسے جمع کرتے ہوئے اس نے کہا "بھئی اللہ ہی مالک ہے۔ اس جگہ تو خدا دشمن کو بھی نہ لائے۔ میری دو لڑکیاں......"

بھاگو نے اس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا "خداوند یسوع مسیح کا شکر کرو بھائی ــــــ تم تو اچھے دکھائی دیتے ہو۔"

"ہاں بھائی شکر ہے خدا کا ــــــ پہلے سے کچھ اچھا ہی ہوں۔ اگر میں کوارنٹین......"

ابھی یہ الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ اس کی نسیں کھنچ گئیں۔ اس کے منہ سے کف جاری ہو گیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ کئی جھٹکے آئے اور وہ مریض جو ایک لمحہ پہلے سب کو اور خصوصاً اپنے آپ کو اچھا دکھائی دے رہا تھا، ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ بھاگو اس کی موت پر دکھائی

نہ دینے والے خونیں کے آنسو بہانے لگا۔ اور کمپاؤنڈر کی موت پر آنسو بہاتا۔ کوئی اس کا وہاں ہوتا تو اپنے جگر دوز نالوں سے ارض و سما کو شق کر دیتا۔ ایک بھاگو ہی تھا جو سب کا رشتہ دار تھا۔ سب کے لئے اس کے دل میں درد تھا۔ وہ سب کی خاطر روتا اور کڑھتا تھا ــــــ ایک دن اس نے خداوند یسوع مسیح کے حضور میں نہایت عجز و انکسار سے اپنے آپ کو بنی نوع انسان کے گناہ کے کفارہ کے طور پر بھی پیش کیا۔

اسی دن شام کے قریب بھاگو میرے پاس دوڑا دوڑا آیا۔ سانس پھولی ہوئی تھی اور وہ ایک دردناک آواز سے کراہ رہا تھا۔ بولا "بابو جی ــــــ یہ کوٹھیں تو دوزخ ہے دوزخ۔ پادری لابے اسی قسم کی دوزخ کا نقشہ کھینچا کرتا تھا ......"

میں نے کہا "ہاں بھائی، یہ دوزخ سے بھی بڑھ کر ہے ــــــ میں تو یہاں سے بھاگ نکلنے کی ترکیب سوچ رہا ہوں ...... میری طبیعت آج بہت خراب ہے۔"

"بابو جی اس سے زیادہ اور کیا بات ہو سکتی ہے ...... آج ایک مریض جو بیماری کے خوف سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسے مردہ سمجھ کر کسی نے لاشوں کے ڈھیر میں جا ڈالا۔ جب پٹرول چھڑکا گیا اور آگ نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو میں نے اسے شعلوں میں ہاتھ پاؤں مارتے دیکھا۔ میں نے کود کر اسے اٹھا لیا۔ بابو جی! وہ بہت بری طرح جھلسا گیا تھا ــــــ اسے بچاتے ہوئے میرا دایاں بازو بالکل جل گیا ہے۔"

میں نے بھاگو کا بازو دیکھا۔ اس پر زرد زرد چربی نظر آ رہی تھی۔ میں اسے دیکھتے ہوئے لرز اٹھا میں نے پوچھا "کیا وہ آدمی بچ گیا ہے۔ پھر ــــــ ؟"

"بابو جی ــــــ وہ کوئی بہت شریف آدمی تھا جس کی نیکی اور شرافت سے دنیا کوئی فائدہ نہ اٹھا سکی، اتنے درد و کرب کی حالت میں اس نے اپنا جھلسا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا اور

اپنی مریل سی نگاہ میری نگاہ میں ڈالتے ہوئے اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔"

"——اور بابوجی"۔ بھاگو نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا جو اس کے کچھ عرصہ بعد وہ اتنا تڑپا، اتنا تڑپا کہ آج تک میں نے کسی مریض کو اس طرح جان توڑتے نہیں دیکھا ہوگا—— اس کے بعد وہ مرگیا۔ کتنا اچھا ہوتا جو میں —— اسے اسی وقت جل جلنے دیتا۔ اسے بچا کر میں نے اسے مزید دُکھ سہنے کے لئے زندہ رکھا اور پھر وہ بچا بھی نہیں، اب انہی تپتے ہوئے بازوؤں سے میں پھر اسے اسی ڈھیر میں پھینک آیا ہوں۔——"

اس کے بعد بھاگو کچھ بول نہ سکا۔ درد کی ٹیسوں کے درمیان اس نے رُکتے رُکتے کہا۔

"آپ جانتے ہیں........ وہ کس بیماری.......... سے مرا؟ پلیگ سے نہیں ——کورنٹین سے—— کورنٹین سے!"

اگرچہ ہمہ یاراں دوزخ کا خیال اس لامتناہی سلسلۂ قہر و غضب میں لوگوں کو کسی حد تک تسلی کا سامان بہم پہنچاتا تھا۔ تاہم مقہور بنی آدم کی فلک شگاف صدائیں تمام شب کانوں میں آتی رہتیں۔ ماؤں کی آہ و بکا، بہنوں کے نالے، بیویوں کے نوحے، بچوں کی چیخ و پکار شہر کی اس فضا میں جس میں کہ نصف شب کے قریب اُلّو بھی بولنے سے ہچکچاتے تھے۔ ایک نہایت المناک منظر پیدا کرتی تھی۔ جب صحیح و سالم لوگوں کے سینوں پر منوں بوجھ رہتا تھا تو ان لوگوں کی حالت کیا ہوگی جو گھروں میں بیمار پڑے تھے اور جنہیں کسی یرقان زدہ کے مانند در و دیوار سے مایوسی کی زردی ٹپکتی دکھائی دیتی تھی اور پھر کورنٹین کے مریض جنہیں مایوسی کی حد سے گزر کر ملک الموت مجسم دکھائی دے رہا تھا، وہ زندگی سے یوں چمٹے ہوئے تھے جیسے کسی طوفان میں کوئی کسی درخت کی چوٹی سے چمٹا ہوا ہو، اور پانی کی تیز و تند لہریں ہر لحظہ بڑھ کر اس چوٹی کو بھی

ڈبو دینے کی آرزومند ہوں۔

میں اس روز تو ہم کی وجہ سے کوارنٹین بھی نہ گیا۔ کسی ضروری کام کا بہانہ کر دیا۔ اگرچہ مجھے سخت ذہنی کوفت ہوتی رہی ـــــ کیونکہ یہ بہت ممکن تھا کہ میری مدد سے کئی مریضوں کو فائدہ پہنچ جاتا مگر اس خوف نے جو میرے دل و دماغ پر مسلط تھا، مجھے پابہ زنجیر رکھا۔ شام کو سوتے وقت مجھے اطلاع ملی کہ آج شام کوارنٹین میں پانسو کے قریب مزید مریض پہنچے ہیں۔

میں ابھی ابھی معدے کو جلا دینے والی گرم کافی پی کر سونے ہی والا تھا کہ دروازے پر بھاگو کی آواز آئی۔ نوکر نے دروازہ کھولا تو بھاگو ہانپتا ہوا اندر آیا۔ بولا: "بابو جی ـــــ میری بیوی بیمار ہو گئی ...... اس کے گلے میں گلٹیاں نکل آئی ہیں ...... خدا کے واسطے اسے بچاؤ ......

اس کی چھاتی پر ڈیڑھ سالہ بچہ دودھ پیتا ہے، وہ بھی ہلاک ہو جائے گا۔"

بجائے گہری ہمدردی کا اظہار کرنے کے میں نے خشمگیں لہجہ میں کہا: "اس سے پہلے کیوں نہ آ سکے ـــــ کیا بیماری ابھی ابھی شروع ہوئی ہے؟"

"صبح معمولی بخار تھا ـــــ جب میں کوارنٹین گیا ......"

"اچھا ـــــ وہ گھر میں بیمار تھی۔ اور پھر بھی تم کوارنٹین گئے؟"

"جی بابو جی ـــــ" بھاگو نے کانپتے ہوئے کہا: "وہ بالکل معمولی طور پر بیمار تھی۔ میں نے سمجھا کہ شاید دودھ چڑھ گیا ہے ـــــ اس کے سوا اور کوئی تکلیف نہیں ـــــ اور پھر میرے دونوں بھائی گھر پر ہی تھے ...... اور سینکڑوں مریض کوارنٹین میں بے بس ......"

"تو تم اپنی حد سے زیادہ مہربانی اور قربانی سے جراثیم کو گھر لے ہی آئے نا۔ میں نہ تم سے کہتا تھا کہ مریضوں کے اتنا قریب مت رہا کرو ـــــ دیکھو میں آج اسی وجہ سے وہاں نہیں گیا۔ اس میں سب تمہارا قصور ہے۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم سے جانباز کو اپنی جانبازی کا مزہ

بھگتنا ہی چاہیئے۔ جہاں شہر میں سینکڑوں مریض پڑے ہیں ...."

بھاگو نے ملتجیانہ انداز سے کہا "مگر خداوند یسوع مسیح ....."

"چلو ہٹو ــــ بڑے آئے کہیں کے ــــ تم نے جان بوجھ کر آگ میں ہاتھ ڈالا ہے اب اس کی سزا میں بھگتوں۔ قربانی ایسے تھوڑے ہی ہوتی ہے۔ میں اتنی رات گئے تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

"مگر پادری لابے ....."

"چلو ــــ جاؤ ــــ پادری ل آبے کے کچھ ہوتے ......"

بھاگو پھر بھاگا۔ وہ وہاں سے چلا گیا۔ اس کے آدھ گھنٹہ بعد جب میرا غصہ فرو ہوا تو میں اپنی حرکت پر نادم ہونے لگا۔ میں عاقل کہاں کا تھا جو بعد میں پشیمان ہو رہا تھا۔ میرے لئے یہی یقیناً سب سے بڑی سزا تھی کہ اپنی تمام خودداری کو پامال کرتے ہوئے بھاگو کے سامنے گزشتہ رویہ پر اظہار معذرت کرتے ہوئے اس کی بیوی کا پوری جانفشانی سے علاج کرتا۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور دوڑتا دوڑتا بھاگو کے گھر پہنچا .... وہاں پہنچنے پر میں نے دیکھا کہ بھاگو کے دونوں چھوٹے بھائی اپنی بھاوج کو چارپائی پر لٹائے ہوئے باہر نکال رہے تھے ــــ

میں نے بھاگو کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا: "اسے کہاں لے جا رہے ہو؟"

بھاگو نے آہستہ سے جواب دیا "کوارنٹین میں ......"

"تو کیا اب تمہاری دانست میں کوارنٹین دوزخ نہیں ــــ بھاگو؟ ..."

"آپ نے جو آنے سے انکار کر دیا۔ بابو جی ــــ اور چارہ ہی کیا تھا۔ میرا خیال تھا وہاں حکیم کی مدد مل جائے گی اور دوسرے مریضوں کے ساتھ اس کا بھی خیال رکھوں گا۔"

"یہاں رکھ دو چارپائی...... ابھی تک تمہارے دماغ سے دوسرے مریضوں کا خیال نہیں گیا؟...... احمق......"

چارپائی اندر رکھ دی گئی اور میرے پاس جو نیر بہت دوائیں تھیں میں نے بھاگو کی بیوی کو پلائی اور پھر اپنے غیر مرئی حریف کا مقابلہ کرنے لگا۔ بھاگو کی بیوی نے آنکھیں کھول دیں۔

بھاگو نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "آپ کا احسان ساری عمر نہ بھولوں گا بابو جی ——"

میں نے کہا "مجھے اپنے گذشتہ رویہ پر سخت افسوس ہے بھاگو ——— ایشور تمہیں تمہاری خدمات کا صلہ تمہاری بیوی کی شفا کی صورت میں دے۔"

اسی وقت میں نے اپنے غیر مرئی حریف کو اپنا آخری حربہ استعمال کرتے دیکھا۔ بھاگو کی بیوی کے لب پھڑکنے لگے۔ نبض جو کہ میرے ہاتھ میں تھی مدھم ہو کر شانہ کی طرف سرکنے لگی۔ میرے غیر مرئی حریف نے جس کی عموماً فتح ہوتی تھی۔ حسب معمول پھر مجھے چاروں شانے چت گرایا۔ میں نے ندامت سے سر جھکاتے ہوئے کہا "بھاگو! بد نصیب بھاگو! تمہیں اپنی قربانی کا یہ عجیب صلہ ملا ہے —— آہ!"

بھاگو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ نظارہ کتنا دلدوز تھا۔ جبکہ بھاگو نے اپنے بلبلاتے ہوئے بچے کو اس کی ماں سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ کر دیا اور مجھے نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ لوٹا دیا۔

میرا خیال تھا کہ اب بھاگو اپنی دنیا کو تاریک پا کر کسی کا خیال نہ کرے گا... مگر اس سے اگلے روز میں نے اسے بیش از بیش مریضوں کی امداد کرتے دیکھا۔ اس نے سینکڑوں گھروں کو بے چراغ ہونے سے بچا لیا ——— اور اپنی زندگی کو ہیچ سمجھا۔ میں نے بھی بھاگو کی تقلید میں نہایت مستعدی سے کام کیا۔ کوارنٹین اور ہسپتالوں سے فارغ ہو کر اپنے فالتو وقت

میں میں نے شہر کے غریب طبقہ کے لوگوں کے گھروں سے، جو کہ بدروؤں کے کنارے پر واقع ہونے کی وجہ سے یا غلاظت کے سبب بیماری کے مسکن تھے، رجوع کیا۔

اب فضا بیماری کے جراثیم سے بالکل پاک ہو چکی تھی۔ شہر کو بالکل دھو ڈالا گیا تھا۔ چوہوں کا کہیں نام و نشان دکھائی نہ دیتا تھا۔ سارے شہر میں صرف ایک آدھ کیس ہوتا جس کی طرف فوری توجہ دیئے جانے پر بیماری کے بڑھنے کا احتمال باقی نہ رہا۔

شہر میں کاروبار نے اپنی طبعی حالت اختیار کر لی۔ سکول، کالج اور دفاتر کھلنے لگے۔

ایک بات جو میں نے شدت سے محسوس کی وہ یہ تھی کہ بازار میں گزرتے وقت چاروں طرف سے انگلیاں مجھی پر اٹھتیں۔ لوگ احسانمندانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے۔ اخباروں میں تعریفی کلمات کے ساتھ میری تصاویر چھپیں۔ اس چاروں طرف سے تحسین و آفرین کی بوچھاڑ نے میرے دل میں کچھ غرور سا پیدا کر دیا۔

آخر ایک بڑا عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں شہر کے بڑے بڑے رئیس اور ڈاکٹر مدعو کئے گئے۔ وزیر بلدیات نے اس جلسہ کی صدارت کی۔ میں صاحب صدر کے پہلو میں بٹھایا گیا کیونکہ وہ دعوت دراصل میرے ہی اعزاز میں دی گئی تھی۔ ہاروں کے بوجھ سے میری گردن جھکی جاتی تھی اور میری شخصیت بہت نمایاں معلوم ہوتی تھی۔ پُرغرور نگاہ سے میں کبھی ادھر دیکھتا کبھی اُدھر ...... وہی آدم کی انتہائی خدمت گزاری کے صلہ میں کمیٹی شکر گزاری کے جذبہ سے معمور ایک ہزار ایک روپے کی تھیلی بطور ایک حقیر رقم میری نذر کر رہی تھی۔

جتنے بھی لوگ موجود تھے، سب نے میرے رفقائے کار کی عموماً اور میری خصوصاً تعریف کی اور کہا کہ گذشتہ آفت میں جتنی جانیں میری جانفشانی اور تن دہی سے بچی ہیں ان کا شمار نہیں۔ میں نے

نہ دن کو دن دیکھا نہ رات کو رات، اپنی جان کو حیاتِ قوم اور اپنے سرمایہ کو سرمایۂ ملت سمجھا اور بیماری کے مسکنوں میں پہنچ کر مرتے ہوئے مریضوں کو جامِ شفا پلایا!

وزیر بلدیات نے میز کے پاس پہلو میں کھڑے ہو کر ایک پتلی سی چھڑی ہاتھ میں لی اور حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے ان کی توجہ اس سیاہ لکیر کی طرف دلائی جو دیوار پر آویزاں نقشے میں بیماری کے دنوں میں صحت کے درجہ کی طرف ہر لحظہ افتاں و خیزاں بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر میں انہوں نے نقشہ میں وہ دن بھی دکھایا جب میرے زیرِ نگرانی چمن مریض رکھے گئے اور وہ تمام صحتیاب ہو گئے۔ یعنی نتیجہ سو فیصدی کامیابی رہا اور وہ سیاہ لکیر اپنی معراج کو پہنچ گئی۔

اس کے بعد وزیر بلدیات نے اپنی تقریر میں میری ہمت کو بہت کچھ سراہا اور کہا کہ لوگ یہ جان کر بہت خوش ہوں گے کہ بخشی جی اپنی خدمات کے صلہ میں لفٹیننٹ کرنل بنائے جا رہے ہیں۔

ہال تحسین و آفرین کی آوازوں اور پُر شور تالیوں سے گونج اٹھا۔

انہی تالیوں کے شور کے درمیان میں نے اپنی پُر غرور گردن اٹھائی۔ صاحبِ صدر اور معزز حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک لمبی چوڑی تقریر کی جس میں علاوہ اور باتوں کے میں نے بتایا کہ ڈاکٹروں کی توجہ کے قابل ہسپتال اور کوارنٹین ہی نہیں تھے۔ بلکہ ان کی توجہ کے قابل غریب طبقہ کے لوگوں کے گھر تھے۔ وہ لوگ اپنی مدد کے بالکل ناقابل تھے، اور وہی زیادہ تر اس موذی بیماری کا شکار رہے۔ میں اور میرے رفقا نے بیماری کے صحیح مقام کو تلاش کیا اور اپنی توجہ بیماری کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں صرف کر دی۔ کوارنٹین اور ہسپتال سے فارغ ہو کر ہم نے راتیں انہی خوفناک مسکنوں میں گذاریں۔

اسی دن جلسہ کے بعد جب میں بطور ایک لفٹیننٹ کرنل کے اپنی پُر غرور گردن کو اٹھائے

ہوئے، ہاروں سے لدا پھندا، لوگوں کا ناچیز ہدیہ ایک ہزار ایک روپے کی صورت میں جیب میں ڈالے ہوئے گھر پہنچا تو مجھے ایک طرف سے آہستہ سی آواز سنائی دی۔

"بابوجی...... بہت بہت مبارک ہو"

—— اور بھاگو نے مبارک باد دیتے وقت وہی پرانا جھاڑو قریب ہی کے گندے حوض کے ایک ڈھکنے پر رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے منڈاسا کھول دیا۔ میں بھونچکا سا کھڑا رہ گیا۔

"تم ہو؟... بھاگو بھائی!" میں نے بمشکل تمام کہا... "دنیا تمہیں نہیں جانتی، بھاگو تو نہ جانے...... میں تو جانتا ہوں۔ تمہارا یسوع تو جانتا ہے..... پادری ل آبے کے بے مثال چیلے...... تجھ پر خدا کی رحمت ہو...!"

اس وقت میرا گلا سوکھ گیا۔ بھاگو کی مرتی ہوئی بیوی اور بچے کی تصویر میری آنکھوں میں کھچ گئی۔ ہاروں کے بار گراں سے مجھے اپنی گردن ٹوٹتی ہوئی معلوم ہوئی اور بٹوے کے بوجھ سے میری جیب پھٹنے لگی اور —— اتنے اعزاز حاصل کرنے کے باوجود میں بے توقیر ہو کر اس قدر شناس دنیا کا ماتم کرنے لگا!

تُلادان

دھوبی کے گھر کہیں گورا چٹا چھوکرا پیدا ہو جائے تو اس کا نام بابو رکھ دیتے ہیں ——

سادھو رام کے گھر بابو نے جنم لیا اور یہ صرف بابو کی شکل و صورت پر ہی موقوف نہیں تھا جب وہ بڑا ہوا تو اس کی تمام عادتیں بابوؤں جیسی تھیں۔ ماں کو حقارت سے اے لیا اور باپ کو چل بے کہنا اس نے نہ جانے کہاں سے سیکھ لیا تھا۔ وہ اس کی رعونت سے بھری ہوئی آواز، پھونک پھونک کر پاؤں رکھنا، جوتوں سمیت چوکے میں چلے جانا، دودھ کے ساتھ بالائی نہ کھانا، سبھی صفات بابوؤں والی ہی تو تھیں۔ جب وہ تحکمانہ انداز سے بولتا اور چل بے کہتا تو سادھو رام "ہی ہی ... باشی بابو" کہہ کر اپنے زرد دانت نکال دیتا اور پھر خاموش ہو جاتا۔

بابو جب سکھ نندن، امرت اور دوسرے امیر زادوں میں کھیلتا تو کسی کو معلوم نہ ہوتا کہ یہ اس مالا کا منکا نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایشور نے سب جیو جنتو کو ننگا کر کے اس دنیا میں

بھیج دیا ہے۔ کوئی لبلی ٹھولی نہیں دی۔ یہ نادار، لکھ پتی، مہابراہمن، بھنوٹ، ہریجن، لنگوا فرنیکا سب کچھ بعد میں لوگوں نے خود ہی ایجاد کیا ہے۔

بدھئی کے پرواہیں سُکھ نندن کے ماں باپ کھاتے پیتے آدمی تھے اور ساد صوبا ام اور دیگر آدمی انہیں کھاتے پیتے دیکھنے والے..... سُکھ نندن کا جنم دن آیا تو بڑے بڑے نیتا گگن دلیہ بھنڈاری، ڈالچند، گنپت، مہابراہمن وغیرہ کھانے پر مدعو کئے گئے۔ ڈال چند اور گنپت مہابراہمن دونوں موٹے آدمی تھے اور قریب قریب ہر ایک دعوت میں دیکھے جاتے تھے۔ ان کی ابھری ہوئی توند کے نیچے پتلی سی دھوتی میں لنگوٹ، بھاری بھرکم جسم پر ہلکا سا جنیو، لمبی چوٹی، چندن کا ٹیکا دیکھ کر بابو جلتا تھا اور بھلا یہ بھی کوئی جلنے کی بات تھی۔ شاید ایک ننھا سا نازک بدن بابو بننے کے بعد انسان ایک بدزیب بے ڈول سا پنڈت بننا چاہتا ہے۔ اور پنڈت بننے کے بعد ایک پست ضمیر گناہگار انسان اور اچھوت..... ڈال چند اور گنپت مہابراہمن کے بچپن کے متعلق بہت سی باتیں مشہور تھیں۔ یہ انسانی فطرت کی نیرنگی ہر جگہ کرشمے دکھاتی ہے۔

بابو نے دیکھا۔ جہاں بھنڈاری اور مہابراہمن، بھنوٹ آئے ہوئے تھے۔ وہاں عداں مراسن، ہرکھو، جرگئی دادا کا رندے اور دو تین جھوٹی پلیٹیں اور دونے اٹھانے والے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ جب دس پندرہ آدمی کھانے سے فارغ ہو جاتے تو جھوٹی پلیٹوں اور دونوں سے بچی کھچی چیزیں ایک جگہ اکٹھی کرتے۔ جمعدارنی صحن میں ایک جگہ چادر کا ایک پلو بچھائے بیٹھی تھی۔ وہ سب بچی کھچی چیزیں حلوہ، دال، لوٹرے ہوئے لقمے، پکوڑیاں ملے ہوئے آلو مٹر اور چاول اس بچھی ہوئی چادر یا ایلومینیم کے ایک بڑے سے زنگ آلود تسلے میں ڈال دیتے۔ اس کے سامنے سب چیزیں کھچڑی دیکھ کر بابو نہ رہ سکا۔ بولا،

"جمعدارنی ــــ کیسے کھاؤ گی یہ چیزیں؟"

جمعدارنی ہنس پڑی، ناک سکیڑتی ہوئی بولی: "جیسے تم روٹی کھاتے ہو۔"

اس عجیب اور سادہ سے جواب سے بابو کی رعونت کو ٹھیس لگی۔ بولا: "کتنی ناسمجھ ہو تم.... اتنی سی بات نہ سمجھیں۔ تبھی تو تم لوگ جوتوں میں بیٹھنے کے لائق ہو۔"

حلالخوری کی اکڑ زبان زدِ عام ہے۔ ماتھے پر تیوری چڑھاتے ہوئے جمعدارنی بولی:

"اور تم تو عرش پر بیٹھنے کے لائق ہو.... ہے نا؟"

"یونہی خفا ہو گئیں تم تو!" بابو بولا: "میرا مطلب تھا سالن میں حلوہ، پکوڑیوں میں آلو مٹر پلاؤ میں فرنی، یہ تمام چیزیں کھچڑی نہیں بن گئیں کیا؟"

جمعدارنی نے کوئی جواب نہ دیا۔

بھنڈاری اور رہا برا ہمن کو اچھی جگہ پر بٹھایا گیا۔ وہ سادھوؤں کی سی رودرکش کی مالا گلے میں ڈالے کنکھیوں سے بار بار عمداں اور جمعدارنی کی طرف دیکھتے رہے۔ عمداں جمعدارنی کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ ہر کھوبڑائی، دادا دھوپ میں بیٹھے ہوئے کھانے پینے آدمیوں کا منہ دیکھ رہے تھے۔ کب وہ سب کھا چکیں تو انہیں بھی کچھ میسر ہو۔ بابو نے دیکھا عمداں کے قریب ہی ایندھن کی اوٹ میں اس کی اپنی ماں بیٹھی تھی۔ اس کے قریب برتن مانجھنے کے لئے راکھ اور نیم سوختہ اوپلے پڑے تھے اور راکھ سے اس کا لہنگا خراب ہو رہا تھا۔ قمیص بھی خراب ہو رہی تھی۔ خیر قمیص کی تو کوئی بات نہ تھی۔ وہ تو کسی کی تھی اور دھلنے کے لئے آئی تھی۔ ایک دفعہ دھو کر بابو کی ماں نے پہن لی تو کچھ بگڑا نہیں گیا۔ پرماتما بھلا کرے بادلوں کا کہ انہی کی مہربانی سے ایسا موقع میسر ہوا۔

جب اپنے دوست سکھی نندن کو ملنے کے لئے بابو نے آگے بڑھنا چاہا تو ایک شخص نے اسے چپت دکھا کر وہیں روک دیا اور کہا: "خبردار! دھوبی کے بچے.... دیکھتا نہیں کدھر

جا رہا ہے؟" بالو سہم گیا۔ سوچنے لگا کہ اس کے ساتھ لڑے یا نہ لڑے۔ جمیدر کا تنو مند جسم دیکھ کر دب گیا اور یوں بھی وہ ابھی بچہ تھا۔ بھلا اتنے بڑے آدمی کا کیا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اس نے ایک بار اس اُچٹتی ہوئی نظر سے اونچی جگہ بیٹھ کر کھانے والوں اور نیم سوختہ اوپلوں کی راکھ اور جوتوں میں پڑے ہوئے انسانوں کو دیکھا اور دل میں کہا۔ اگرچہ سب ننگے پیدا ہوئے ہیں مگر ایک کارندے اور براہمن میں کتنا فرق ہے۔

پھر دل ہی دل میں کہنے لگا۔ سکھ نندن اور بالو میں کتنا فرق ہے۔ اور ہلکی سی ایک ٹیس اس کے کلیجہ میں اُٹھی حقیقت تو بالو کے سامنے تھی۔ مگر اتنی مکروہ شکل میں کہ وہ خود اسے دیکھنے سے گھبراتا تھا۔ بالو دل ہی دل میں کہنے لگا "ہم لوگوں کے وجود ہی سے تو یہ لوگ جیتے ہیں۔ دلہن کی طرح اُجلے اُجلے کپڑے پہنتے ہیں........" دراصل بالو کو بھوک لگ رہی تھی۔ دہی پکوڑیاں، حلوہ مانڈہ کے خیال میں ــــ مگر وہ حقیقت تو کیا وہ اپنے وجود سے بھی بے نیاز ہو گیا۔ گرم گرم پوریوں کی صبر آزما خوشبو اس کے دماغ میں بسی جا رہی تھی۔ اچانک اس کی نظر عمداں پر پڑی۔ عمداں کی نظر بھی ٹوکری میں گھی میں بسی ہوئی پوریوں کے ساتھ ساتھ بہاتی تھی جب سکھ نندن کی ماں قریب سے گزری تو اس کو متوجہ کرنے کے لئے عمداں بولی:

"بھجانی........ ذرا حلوائی کو ڈانٹو تو....... اسے دیکھتیں نہیں، کتنا گھی بہہ رہا ہے جمین (زمین) پہ"۔

بھجانی کڑک کر بولی:

"ارے او کشنو..... حلوائی کو کہنا۔ ذرا پوریاں کڑاہی میں دبائے رکھے۔"

بالو ہنسنے لگا۔ عمداں کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔ بالو جانتا تھا کہ عمداں وہ سب باتیں محض اس وجہ سے کر رہی ہے کہ اس کا بیٹا جی پوریاں کھانے کو بہت چاہتا ہے۔ گو بھجانی کی توجہ کو کھینچے

والے نقرے سے اس کی خواہش کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ متعجب تھا اور سوچ رہا تھا کہ جس طرح اس نے عبداللہ کے ان غیر متعلق لفظوں میں چھپے ہوئے اصلی مطلب کو پا لیا ہے۔ کیا ایسا بھی ممکن ہے کہ اس کی خاموشی میں کوئی اس کی بات کو پا لے۔ آخر خاموشی گفتگو سے زیادہ معنی خیز ہوتی ہے۔

اس وقت سکھ نندن تل رہا تھا۔ خوبصورت ترازو کے ایک پلڑے میں بیٹھا چاروں طرف دیکھ کر مسکراتا جا رہا تھا۔ دوسری طرف گندم کا انبار لگا تھا۔ گندم کے علاوہ چاول باسمتی، چنے، ارہر، موٹے ماش اور دوسری اس قسم کی اجناس بھی موجود تھیں۔ سکھ نندن کو تول تول کر لوگوں میں اجناس بانٹی جا رہی تھیں۔ بالو کی ماں نے بھی پلو بچھایا۔ اسے گندم کی دھڑی مل گئی۔ وہ سکھ نندن کی درازی عمر کی دعائیں مانگتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ بالو نے نفرت سے اپنی ماں کی طرف دیکھا گویا کہہ رہا ہو۔ "بھی! انہیں کپڑوں کی دھلائی پر قناعت ہی نہیں تھی تو مرایک [illegible] نکالنے کا کام ایشور نے تمہارے سپرد کر دیا ہے اور تم بھی جمعدانی کی طرح جوتوں میں بیٹھنے کے لائق ہو۔ تمہاری کوکھ سے پیدا ہو جانے والے بالو کو چلچلاتی دھوپ میں کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ آگے بڑھنے پر لوگ اسے چپت دکھلاتے ہیں۔ ہائے اتری پھٹی ہوئی، بے قناعت آنکھیں گندم سے نہیں قبر کی مٹی سے پر ہوں گی۔ قریب سے مل گذری تو بالو بولا۔" اے پُر!"

پھر سوچنے لگا۔ رام جانے میرا جنم دن کیوں نہیں آتا۔ میری ماں مجھے کبھی نہیں تولتی۔ جب سکھ نندن کو اس کے جنم دن کے موقع پر تول کر اجناس کا دان کیا جاتا ہے تو اس کی سبھی مصیبتیں ٹل جاتی ہیں۔ اسے سردی میں برف سے زیادہ ٹھنڈے پانی اور گرمیوں میں جھلسا دینے والی دھوپ میں کھڑا نہیں ہونا پڑتا۔ بالوں میں لگانے کے لئے خاص

لکھنؤ سے منگوایا ہوا آملے کا تیل ملتا ہے۔ جیب پیسوں سے بھری رہتی ہے۔ بخلاف اس کے میں تمام دن صابن کی جھاگ بناتا رہتا ہوں۔ سکھ نندن اس لئے صابن کے بلبلوں کو پسند کرتا ہے کہ وہ بلبلے اور ان میں چمکنے والے رنگ اسے ہر روز نہیں دیکھنے پڑتے۔ یوں کپڑے نہیں دھونے ہوتے..... سکھی کی دنیا کو کتنی ضرورت ہے۔ خاص کر اس کے ماں باپ کو..... میرے ماں باپ کو میری ذرا بھی ضرورت نہیں۔ ورنہ وہ مجھے بھی جنم دن کے موقع پر یونہی تولتے۔ اور جب سے ننھی پیدا ہوگئی ہے..... کہتے ہیں بلا ضرورت دنیا میں بھی کوئی پیدا نہیں ہوا۔ یہ باتھو جو نالی کے کنارے اُگ رہا ہے۔ بظاہر ایک فضول سا پودا ہے، جب اس کی بھجیا بنتی ہے تو مزا ہی آجاتا ہے..... اور پوریاں!

بالو کی ماں نے آواز دی:

"بالو..... ارے او بالو!"

اس وقت سکھ نندن بالو کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اب بالو کو امید تھی کہ وہ خوب ضیافت اڑا سکے گا۔ بالو اس چبھنے والی دھوپ کو بھی بھول گیا جو برسات کے بعد تھوڑے عرصہ کے لئے نکلتی ہے۔ اور اسی عرصہ میں اپنی تب و تاب ختم کر دینا چاہتی ہے۔ اس نے ماں کی آواز پہ کان نہ دھرا۔ وہ کان دھرتا بھی کیوں؟ ماں کو اس کی کیا ضرورت تھی۔ ضرورت ہوتی تو وہ اس کا جنم دن نہ مناتی؟ وہ تو شاید اس دن کو کوستی ہوگی جس دن وہ پیدا ہوگیا..... اگرچہ باتھو کی بھجیا بڑی ذائقہ دار ہوتی ہے۔

"بالو..... ارے او بالو کے بچے! آتا کیوں نہیں؟" بالو کی ماں کی آواز آئی۔

"بالو جاؤ..... ابھی میں نہیں آسکتا!" سکھ نندن نے کہا اور پھر ایک مغرورانہ انداز سے اپنے زردوختہ کوٹ اور بالو کی طرف دیکھتا ہوا بولا: "بدکل آتا بھائی..... مجھے نہیں ہوا آج

مجھے فرصت ہے؟ جاؤ۔“

محلہ اس کو پوریاں مل گئی تھیں۔ وہ بھابی کو فرشی سلام کر رہی تھی۔ بابو نے سوچا تھا کہ شاید مسکراتا ہوا سُکھ نندن اس کی خاموشی میں اس کے من کی بات پا لے گا مگر سُکھ نندن کو آج بابو کا خیال کہاں آتا تھا۔ آج ہر چھوٹے بڑے کو سُکھی کی ضرورت تھی لیکن سُکھی کو کسی کی ضرورت نہ تھی۔ اپنی عظمت اور بابو کے سادہ اور بوسیدہ ٹاٹ کے سے کپڑوں کو دیکھ کر شاید وہ اس سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اپنی عدیم الفرصتی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے گویا بابو کی رہی سہی رعونت کو مٹی میں ملا دیا۔ پھر بابو کی ماں کی کرخت آواز آئی:

”بابو.... تیرا ستیاناس، طوق (طاعون) مارے..... گھس جائے تیرے پیٹ میں ماتا کالی... آتا کیوں نہیں۔ دو سو کپڑے پڑے ہیں.... لمبر گیرنے والے ہیں تو سو رہی ہوں تیری جان کو.....“

بابو کو یہ محسوس ہوا کہ نہ صرف سُکھ نندن نے اس کے جذبات کو ٹھیس لگائی ہے اور وہ اس کے ساتھ کبھی نہیں کھیلے گا۔ بلکہ اس کی ماں جس کے پیٹ سے وہ ناحق پیدا ہوا تھا۔ وہی عورت جس سے اسے دنیا میں سب سے زیادہ پیار کی توقع ہے وہ اس سے ایسا سلوک کرتی ہے۔ کاش! میں اس دنیا میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ اگر ہوتا تو یوں بابو نہ ہوتا۔ میری مٹی یوں خراب نہ ہوتی۔ آخر میں سُکھی سے شکل اور عقل میں بڑھ چڑھ کر نہیں؟

سُکھ نندن کے جنم دن کو ایک ہفتہ ہو گیا۔ تلادان میں آئی ہوئی گندم بھی پیسی گئی۔ اس کی روٹی بنی۔ بابو کے ماں باپ نے کھائی۔ مگر بابو نے وہ روٹی کھانے سے انکار کر دیا جتنی دیر تلادان کا آٹا گھر میں رہا وہ روٹی اپنے چچا کے ہاں کھاتا رہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جس طرح مانگے تانگے کی چیزیں کھا کھا کر اس کے ماں باپ کی ذہنیت غلامانہ ہو گئی ہے وہ روٹی کھا کر

اس میں بھی وہ بات آجائے۔ گاڑھے پسینہ کی کمائی ہوئی روٹی سے تو دودھ ٹپکتا ہے۔ مگر حرام کی کمائی سے خون ۔۔۔۔۔۔ اور غلامی خون بن کر اس کے رگ و ریشہ میں سما جائے، یہ کبھی نہ ہوگا۔ سادھو رام حیران تھا۔ بالو کی ماں حیران تھی۔ چچا جس پر اس کی روٹی کا بوجھ چڑھ گیا تھا، حیران تھے۔ چچی ناک بھوں چڑھاتی تھی اور جب گھر میں اس انوکھے بائیکاٹ کا چرچا ہوتا تو سادھو رام یک دم کپڑوں پر ٹمبر گیرنے اچھو ٹھو دیتا اور زرد زرد دانت نکالتے ہوئے کہتا:

”جی جی ۔۔۔۔ بالو ہے نا“

سکھ نندن نے اب بالو میں ایک نمایاں تبدیلی دیکھی۔ بالو جس کا کام سے جی اچاٹ رہتا تھا۔ اب دن بھر گھاٹ پر اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا۔ بالو اب اس کے ساتھ نہیں کھیلتا تھا۔ ہریا کے تالاب کے کنارے ایک بڑی سی کرشن چپل پر وہ اور اس کے دو ایک ساتھی سکول کے وقت کے بعد کان پٹہ کھیلا کرتے تھے۔ اب وہ جگہ بالکل سونی پڑی رہتی تھی۔ قریب بیٹھے ہوئے ایک سادھو جن کی کٹیا میں بچے اپنے بستے رکھ دیتے تھے۔ کبھی کبھی چرس کا ایک لمبا کش لگاتے ہوئے پوچھ لیتے ”بیٹا! اب کیوں نہیں آتے کھیلنے کو“ اور سکھی نندن کہتا ”بالو ناراض ہو گیا ہے بابا ۔۔۔۔“ پھر بابا جی ہنستے اور چرس کا ایک دم الٹا دینے والا کش لگاتے اور کھانستے ہوئے کہتے:

”اوہوں ۔۔۔۔ ہوں ۔۔۔۔ واہ رے بچے ۔۔۔۔ آخر بالو جو ہوا نا“

اس وقت سکھی نندن غرور سے کہتا ”اکڑتا ہے بابو تو اکڑا کرے ۔۔۔۔ اس کی اوقات کیا ہے دھوبی کے بچے کی؟“

۔۔۔۔ مگر بچوں کو اپنے ساتھ کھیلنے کے لئے کوئی نہ کوئی چاہئے۔ کھیل میں کسی طرح کی

ذات پات اور درجے کی تمیز نہیں رہتی۔ حقیقت میں چند ہی سال کی تو بات تھی جب کہ وہ دونوں ننگے پیدا ہوئے تھے اور اس وقت تک ان میں نادار، نکھ پتی، مہا براہمن، کھوٹ، ہریجن۔ اور اس قسم کی فضول باتوں کے متعلق خیال آرائی کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔

سکھ نندن اپنی تمام مصنوعی عظمت کو کینچلی کی طرح اتار پھینک بابو کے ہاں گیا۔ بابو اس وقت دن بھر کام کرکے تھک کر سو رہا تھا۔ ماں نے جھنجوڑ کر جگایا "اٹھ بیٹا!...... اب کھیلنے کبھی نہ جاؤ گے کیا؟ سکھی آیا ہے" بابو آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ چارپائی کے نیچے اس نے بہت سے میلے کچیلے اور اُجلے اُجلے کپڑے دیکھے۔ کپڑے جو کہ پیدائش ہی سے ایک سکھی نندن اور بابو میں امتیازی تفرقہ پیدا کر دیتے ہیں...... بابو چارپائی پر سے فرش پر بکھرے ہوئے کپڑوں پر کود پڑا۔ دل میں ایک لطیف گدگدی سی پیدا ہوئی۔ کئی دنوں سے وہ کھیلا نہیں تھا اور اب شاید اپنی اکتسابی رعونت پر پچھتا رہا تھا۔ بابو کا جی چاہتا تھا کہ پھلانگ کر برآمدے سے باہر چلا جائے اور سکھی سے بغلگیر...... اور کیا انسان کی انسان کے لئے محبت کپڑوں کی حد سے نہیں بڑھ جاتی؟ کیا سکھی کینچلی نہیں اتار آیا تھا؟ بابو چاہتا تھا کہ دونوں بھائی رہیں سب کپڑے اتار کر ایک سے ہو جائیں اور خوب کھیلیں، خوب......

برآمدے میں کبوتروں کے کابک کے پیچھے جالی کے درمیان میں سے بابو کی نظر سکھی پر پڑی جو پُر امید نظریں اس کے گھر کے دروازے پر گاڑے کھڑا تھا۔ یکایک بابو کو سکھی کے جنم دن کی بات یاد آگئی۔ وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ کبوتروں کی جالی میں اسے بہت سی چیزیں نظر آرہی تھیں اور بہت سے سراج، لکّہ اور دیسی قسم کے کبوتر گھوں گھوں کرتے ہوئے اپنی گردنوں کو پھلا رہے تھے۔ ایک نر پھول پھول کر مادہ کو اپنی طرف مائل کر رہا تھا۔ بابو نے بھی اپنی گردن کو پھلا لیا اور گھوں گھوں کی سی آواز پیدا کرتا ہوا چارپائی پر واپس جا لیٹا۔ پھر اسے خیال آیا۔

لگی دھوپ میں کھڑا جل رہا ہے۔ مگر پھر وہ ایک فیصلہ کن لائحہ عمل مرتب کرتے ہوئے چارپائی پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ آخر وہ بھی تو کتنا ہی عرصہ اس کچے گھر کے صحن میں برسات کی چلچلاتی دھوپ میں کھڑا رہا تھا اور اس نے اس کی کوئی پرواہ کی تھی..... اہیر ہوگا تو اپنے گھر میں۔

"اسے کہہ دو...... وہ نہیں آئے گا ماں..... کہو اسے فرصت نہیں ہے فرصت"

بابو نے کہا۔

"شرم تو نہیں آتی تجھے" ماں نے کہا۔ "اتنے بڑے سیٹھوں کا لڑکا آوے، تجھے بلانے کے لئے اور تو یوں پڑا ہے...... گدھا!"

بابو نے کہنیاں ہلاتے ہوئے کہا "میں نہیں جانے کا ماں!"

ماں نے برا بھلا کہا تو بابو بولا "سچ سچ کہہ دوں ماں۔ میں جانتا ہوں۔ میری کسی کو کبھی ضرورت نہیں...... واویلا کرو گی تو میں کہیں چلا جاؤں گا!"

ماں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس وقت ننھی بلند آواز سے رونے لگی اور ماں اسے دودھ پلانے میں مشغول ہو گئی۔

بستی کے پرواہیں سیتلا (چیچک) کا زور تھا۔ پڑوس کی عورتیں بندریوں کی طرح اپنے اپنے بچوں کو کلیجوں سے لگائے پھرتی تھیں۔ پڑوسن کی دہلیز تک نہیں پھاندتی تھیں۔ کہیں تو نہ پکڑ لیں۔ اور سیتلا ماتا تو یوں بھی بڑی غصیلی ہیں...... ڈال چند کی لڑکی، جھابرا من کے دو بھتیجے سب کو سیتلا ماتا نے درشن دیا۔ ان کی مائیں گھنٹوں ان کے سرہانے بیٹھ کر بچے موتیا کے ہار رکھ کر گوری میا گاتی رہیں اور دیوی ماتا سے پرارتھنا کرتی رہیں کہ ان پر اپنا غصہ نہ نکالے۔ جب بچے راضی ہو جاتے تو مندر میں ماتھا ٹیکنے کے لئے لے جاتیں۔ ماتا تو

ہر ایک قسم کی خواہش پوری کرتی تھی۔ جب سیتلا کا غصہ ٹلا اور وبا کچھ کم ہوئی تو پُروا والوں نے سیتلا کی مورتی بنائی۔ اسے خوب سجایا۔ سکھی نندن کے باپ نے مہنگے کی مالا سیتلا ماتا کے گلے میں ڈالی۔ سب نے مل کر عزت و تکریم سے ماتا کو مندر سے نکالا اور ایک سجی ہوئی بہلی میں براجمان کیا اور بہلی کو گھسیٹتے ہوئے گاؤں سے باہر چھوڑنے کے لئے لے گئے۔ پُروا کے سب بچے بوڑھے جلوس میں اکٹھے ہو گئے۔ پیتل کی کرتالیں، ڈھول ڈھمکے بجتے جا رہے تھے۔ لوگ چاہتے تھے کہ کرودھی ماتا کو ہریا کے تالاب کے پاس مہاتما جی کی کٹیا کے قریب ان ہی کی نگرانی میں چھوڑ دیا جائے۔ تاکہ ماتا اس گاؤں سے کسی دوسرے گاؤں کا رُخ کرے۔ وہ ماتا کو خوشی خوشی روانہ کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ ان پر اُلٹی نہ بپتا پڑے۔ سکھی بھی جلوس کے ساتھ گیا۔ بالو بھی شامل ہوا۔ نہ بالو کو سکھی کے بلانے کی جرأت پیدا ہوئی۔ نہ سکھی کو بالو کے بلانے کی۔ ہاں کبھی کبھی وہ کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تھے۔

ہریا کے تالاب کے پاس ہی دھوبی گھاٹ تھا۔ ایک چھوٹی سی نہر کے ذریعہ تالاب کا پانی گھاٹ کی طرف کھینچ لیا جاتا تھا۔ گھاٹ تھا بہت لمبا چوڑا۔ قریب کے قصبوں میں سے دھوبی کپڑے دھونے آیا کرتے تھے۔ اسی گھاٹ پر بالو اور اس کے بھائی بند باپ بلوا وہی ایک گانا، اسی پرانی سُر تال سے گاتے ہوئے کپڑے دھوتے جاتے۔ ایک دن گھاٹ پر سارا دن بالو سکھی کے بغیر شدت کی تنہائی محسوس کرتا رہا۔ کبھی کبھی اکیلا ہی کروٹن چیل کے بل کھاتے ہوئے تنوں پہ چڑھ جاتا اور اُتر آتا۔ گویا سکھی کے ساتھ کان پتہ کھیل رہا ہو۔ کھیل میں لطف نہ آیا تو وہ اینٹوں کے ڈھیر میں رکھی ہوئی سیتلا ماتا کی مورتی کو دیکھنے لگا، اور پوچھنے لگا۔ آیا وہ اس گاؤں سے چلی گئی ہیں یا نہیں۔ ماتا کچھ کر دپ رہ گئی۔ تلاش

دکھائی دیتی تھیں۔ شام کو بالو گھر آیا تو اسے ہلکا ہلکا تپ تھا جو کہ بڑھتا گیا۔ بالو کو اپنی سدھ بدھ نہ رہی۔ ایک دفعہ بالو کو ہوش آیا تو دیکھا ماں نے موتیا کا ایک ہار اس کی چارپائی پر رکھا تھا قریب ہی ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا کورا گھڑا تھا۔ گھڑے کے منہ پر بھی موتیا کے ہار پڑے تھے اور وہاں ایک نیا خریدا ہوا پنکھا جھلے بیٹھا کر منہ میں گودی میا گنگنا رہی تھی۔ پنکھا مرتے ہوئے آدمی کی نبض کی طرح آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور الگنی پر سرخ پھلکاریوں کے پردے بالو کی بوڑھی دادی کی جھریوں کی طرح لٹک رہے تھے اور یہ سامان سب کچھ ماتا کی عزت کی وجہ سے کیا گیا تھا۔ بالو نے اپنی پلکوں پر منوں بوجھ محسوس کیا۔ اسے تمام بدن پر کانٹے چبھ رہے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اسے کسی بھٹی میں جھونک دیا گیا ہو۔

دو تین دن تو بالو نے پہلو تک نہ بدلا۔ ایک دن ذرا افاقہ سا ہوا۔ صرف اتنا کہ وہ آنکھیں کھول کر دیکھ سکتا تھا۔ آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا، سکھی اور اس کی ماں دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ سکھانی نے ناک پر دوپٹہ رکھا تھا۔ دراصل وہ دروازے میں اس لئے بیٹھے تھے کہ کہیں بیماری نہ پکڑ لیں۔ مگر بالو نے سمجھا آج ان لوگوں کا غرور ٹوٹا ہے اس نے دل میں ایک خوشی کی لہر محسوس کی۔ ایک جوتشی جی سادھو رام کو بہت سی باتیں بتا رہے تھے، انہوں نے ناریل بتاشے بھیمتی منگوائی۔ سادھو رام کبھی کبھار اپنا ہاتھ بالو کے تپتے ہوئے ماتھے پر رکھ دیتا اور کہتا:

"بالو..... او بالو..... بیٹا بالو"

جواب نہ ملتا تو ایک مکا سا اس کے کلیجہ میں لگتا اور وہ گم ہو جاتا۔

بالو نے بمشکل تمام کانٹوں سے بستر پر پہلو بدلا۔ پھول ہاتھ سے سرکا کر سرہانے کی طرف رکھ دیئے۔ گلے میں تلخی سی محسوس کی۔ ہاتھ بڑھایا تو ماں نے پانی دیا۔ بالو نے

دیکھا اس کے ایک طرف گندم کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ جیوتشی جی کے کہنے پہ بابو کی ماں نے اسے آہستہ سے اُٹھایا اور ایک طرف لٹکتے ہوئے ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیا۔ ترازو کے دوسرے پلڑے میں گندم اور دوسری اجناس ڈالنی شروع کیں۔ بابو نے اپنے آپ کو تُلتا ہوا دیکھا تو دل میں ایک خاص قسم کا روحانی سکون محسوس کیا۔ چار دن کے بعد آج اس نے پہلی مرتبہ کچھ کہنے کے لئے زبان کھولی اور اتنا کہا:

"اماں...... کچھ گندم اور ماش کی دال دے دو مُکھی کی ماں کو..... کب سے بیٹھی ہے بیچاری؟"

سادھو رام نے پھر اپنا ہاتھ بابو کے تپتے ہوئے ماتھے پہ رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی چند بوندیں گر کر فرش پہ بکھرے ہوئے کپڑوں میں جذب ہو گئیں۔ سادھو رام نے کپڑوں کو ایک طرف ہٹایا اور بولا:

"پنڈت جی........ دان سے بوجھ ٹل جائے گا؟........ میں تو گھر بار بیچ دوں..... پنڈت جی....."

بابو کی ماں نے سسکیاں لیتے ہوئے سیٹھانی جی کو کہا:

"مالکن....... کل نینی تال جاؤ گی؟..... کل..... نہیں تو پرسوں ملیں گے کپڑے..... ہائے، مالکن! تمہیں کپڑوں کی پڑی ہے۔"

بابو کو کچھ شک سا گذرا۔ اس نے پھر تکلیف سہہ کر پہلو بدلا اور بولا:

"اماں..... اماں..... آج میرا جنم دن ہے؟"

اب سادھو رام کے سوتے پھوٹ پڑے۔ ایک ہاتھ سے گلے کو دباتے ہوئے وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا:

"ہاں بالو بیٹا..... آج جنم دن ہے تیرا..... بالو..... بیٹا!"

......بالو نے اپنے جلتے ہوئے جسم اور رُوح پر سے تمام کپڑے اتار دئے۔ گویا ننگا ہو کر سکھی ہو گیا۔ اور منوں بوجھ محسوس کرتے ہوئے آنکھیں آہستہ آہستہ بند کر لیں!

دس منٹ بارش میں

...... ایک بچہ روڈ شام کے اندھیرے میں گم ہو رہی ہے۔ یوں دکھائی دیتا ہے جیسے کوئی کشادہ سا راستہ کسی کوئلے کی کان میں جا رہا ہے...... سخت بارش میں درونشا کی ہار، سفرینا کا گلاب، قطب سید حسین مکی کے مزار شریف کے کھنڈر میں، ایک کھلتے ہوئے مشکی رنگ کی گھوڑی جس کی پشت نم آلود ہو کر سیاہ ساٹن کی طرح دکھائی دے رہی ہے۔ سب بھیگ رہے ہیں —— اور راٹا بھیگ رہی ہے!

راٹا کون ہے؟ اسے کلپ برکش کہہ لو یا کام وحین گلنے۔ یا اس سے بہتر راٹا۔ راٹا ہے پھرایا لال کی بیوی' ایک دس سالہ کاہل، جاہل، نااہل چھوکرے کی ماں۔ چند ماہ ہوئے تخفیف کے موقع پر ہیوم پائپ کمپنی والوں نے پھرایا لال کو کام سے الگ کر دیا. اس وقت سے اس کی پرسکون زندگی میں قسمت کے گرد باد پیدا ہونے لگے۔ تلاشِ معاش

ہیں نہ جانے وہ کہاں چل دیا۔ سنا ہے کہ وہ راتا کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا ہے۔ کیونکہ وہ جس سے محبت کرتی ہے اور جس شخص میں محبت کی سی کمزوری ہو، وہ پائے استحقار سے ٹھکرا دیا جاتا ہے...... مرحوم تیزابی کا بیان ہے کہ پچھلے ایک سرد، نیلے سے دھندلکے میں اس نے پھرایا لال کو اپنی ہی برادری کی ایک عورت کے ساتھ چلتے دیکھا تھا۔ وہی عورت —— کوڑی، جو ابوبکر روڈ کے مکانوں میں سے گملے اٹھایا کرتی تھی۔ ان دنوں پھرایا لال بے کار تھا۔ بے کار انسان کے عقل و فکر میں خونِ جگر پینے یا کثرت سے محبت کرنے کے سوا اور کچھ نہیں سماتا۔ بعض آدمیوں نے پھرایا کو کوٹ تپلی میں صفیں بناتے ہوئے دیکھا ہے قریب ہی کوڑی ایک غیر آدمی کے ساتھ مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی...... راتا پھر بھی پھرایا لال کو دل سے چاہتی ہے۔ یہ محبت اور جنون کے انداز بھی کبھی چھٹتے ہیں؟......

اور راتا بھیگ رہی ہے۔

راتا کی گھوڑی ابوبکر روڈ پر ہماری کوٹھی کے سامنے گھوم رہی ہے۔ وہ اس کا شبِ دیجور کا سارنگ!...... صرف اس کے ہنہنانے اور کبھی کبھی بجلی کے کوندنے سے اس کے وجود کا علم ہوتا ہے۔ صبح سے بیچاری کو دانہ نہیں دیا گیا۔ نہ ہی اس کی موچ والی ٹانگ پر پٹی لگائی گئی ہے۔ بھوک کی شدت سے بے بس اور بگڑ کر وہ آوارہ ہو رہی ہے۔ شاید پھرایا کو ڈھونڈتی ہو گی۔ پھرایا —— جو اسے بھی چھوڑ کر کوڑی کے ساتھ چلا گیا ہے کوڑی جو کوٹ تپلی میں کسی دوسرے مرد کے ساتھ مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی۔ ایک وقت میں ایک دل کے اندر مشکی گھوڑی رہ سکتی ہے یا کوڑی۔ کوڑی یا راتا......
اور بھوکی مشکی گھوڑی ہنہناتی ہے جیسے کبھی سکندر سے جدا ہونے پر بوسی فیلس ہنہناتا تھا۔

راٹنا اپنے سر سے بوریے کی اوڑھنی اٹھا کر پوچھتی ہے۔

"بابو جی ـــ آپ نے یہاں رامی نہیں دیکھی؟ ...... رامی ...... میری مشکی گھوڑی؟"

میں نے کہا "رامی، کون رامی؟ ...... اچھا رامی تمہاری مشکی گھوڑی۔ ارے! وہ دیکھنا کی باڑ کے پیچھے تو کھڑی ہے۔ تمہیں دکھائی نہیں دیتی کیا؟"

راٹنا آنکھوں کو سکیڑ کر باڑ کی طرف دیکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے جب کھلتے ہوئے مشکی رنگ کی گھوڑی شام کے وقت بارش میں بھیگ جاتی تو وہ بھی شب دیجور کا ایک جزو بن جاتی ہے، اور سنے نعد، بدرو کر جت گنوائی آنکھوں کو اسے تاریکئ شام یا شام تاریکی سے جدا کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے ...... بارش کی رم جھم، سرس کی لمبی لمبی پھلیوں کی کھڑکھڑ، گرتے ہوئے پتوں کے نوحے، رعد کی گرج، جھینگروں کی لیطا لیط، مینڈکوں کی ٹراہٹ، پرنالوں کے شور، اس کتیا کی اونہہ ـــ اونہہ جس نے ابھی ابھی سات بچوں کا جھول جنا ہے۔ اور ایک سنچے کو منہ میں پکڑے کسی سوکھی، نرم و گرم جگہ کی متلاشی ہے۔ ان سب کے شور و غوغا میں بھلا گھوڑی کی جگہ وہ نہناہٹ علیحدہ سنائی دیتی ہے۔

پیا شر کہتا ہے "میں بھیگ رہا ہوں ...... اور وہ بھی بھیگ رہی ہے۔"

ماں خفا ہوتے ہوئے کہتی ہے "گیلا ...... گیلا ...... گیلا ...... تو تو بالکل گھنے والا ہو گیا ہے۔ ایں! یہ موئی کتیا تو یہیں چھپی بیٹھی ہے۔ میرا تنور گر جائے گا۔ یہ بے وقت کی بارشیں، رحم رے ......!"

ننھی نشی کا فراک گر کر صحن میں پڑا ہوا یوں دکھائی دیتا ہے جیسے کوئی مری ہوئی فاختہ۔ ماں ناراض ہے کہ میں نے نشی کا فراک کیوں نہیں اٹھایا۔ حالانکہ راٹنا کی گھوڑی کے چکر میں میں سر سے پاؤں تک بھیگ گیا۔ ماں اس لئے بھی خفا ہے کہ میں پرانے جیسے آوارہ مزاج

نوجوانی کے ساتھ بارش میں لنگوٹا باندھ کر نہانے کے لیے چلا ہوں۔ ماں کا خیال ہے کہ میں بھی اس کے ساتھ رہ کر آوارہ ہو جاؤں گا۔ حقیقت میں ماں کے ماتھے پر بل اس لئے ہیں کہ میں نے راما کو مشکی گھوڑی پکڑنے میں مدد دی ہے۔ گھوڑی کو شام کی تاریکی سے علیحدہ کرتے ہوئے اس کی ایال راما کے ہاتھ میں دے دی ہے اور اس عمل کے ارتکاب میں اس سے چھو گیا ہوں۔

میں نے کہا: ارے اسی پرائشچت میں تو میں نہا چکا ہوں، ماں!

حقیقت تو یہ ہے کہ میں اس قسم کی آلودگی کو پسند کرتا ہوں۔ بیلا شرکا کیا دیوتو ہر قسم کی آلودگی کو پسند کرتا ہے...... کاش! پھر ایالال کبھی نہ آتے اور راما کو ہر ایک کام کے لئے ہمارا مرہون منت ہونا پڑے۔ کیا وہ گھوڑی ہی پکڑوائے گی، اور کوئی کام نہیں کرے گی؟

ماں کہتی ہے، لوہار، بڑھئی، چمڑہ رنگنے والے ایک برہمن کو چوبیس قدم، چمار دس بونے والے اڑتالیس قدم، مونا مانس کھانے والے چونسٹھ قدم پرے سے بھرشٹ کر سکتے ہیں۔

مگر میں ماں کو کہتا ہوں، ماں! ان لوگوں ہی کی وجہ سے تو ہم زندہ ہیں۔ براہمن کھیتی کی یہ لوگ باڑ ہیں...... اور پھر تھوڑی بہت برائی بھلائی کو بچانے کے لئے ضروری ہے

ماں کہتی ہے۔ کل جگ ہے بیٹا گھور کل جگ!

بظاہر ماں پشن سے باتیں کرتی ہے۔ مگر دراصل اس کا مقصد سب کچھ مجھے سنانا ہوتا ہے۔ مہا جگیہ برہما کا ایک دن ہے۔ کرت، ترتا، دواپر اتنے لاکھ برسوں کے ہیں۔ کل جگ چار لاکھ بتیس ہزار برس کا ہے۔ پچھلے برس جیوتشی کہتے تھے کل جگ کو صرف پانچ ہزار چھبیس برس گزرے ہیں۔ رام جانے ابھی کتنے باقی ہیں — اور یہ سب وقت

کی بارشیں!"

"بارش نے کافی سردی پیدا کر دی ہے" میں نے کہا۔

"ہاں بھائی...... میرے تو دانت بجنے لگے ہیں..... چلو برآمدہ میں چلیں؟"

"لیکن..... ابھی بہت وقت تو نہیں ہوا"

"چائے بنا دو نا — سردی ہو رہی ہے"

"چائے بن جائے گی۔ سگرٹ نہیں ملیں گے"

"کوئی بات نہیں! بیڑیاں جو ہیں میرے کوٹ کی جیب میں"

"ہمارے ٹی سنڈیکیٹ کو آج کل بارش بہت فائدہ مند ہے"

"ہاں — چائے کے پودوں کی ڈھلوان جنوب کی طرف ہے۔ ابوبکر روڈ کا تمام پانی ادھر نہیں جاتا۔ مگر زیادہ بوچھاڑ چائے کے پودوں کے لئے نقصان دہ ہے جڑیں گل جانے کا اندیشہ ہے۔ ہلکی ہلکی پھوار کا تو کہنا ہی کیا...... کچھ بھی ہو۔ یہ بارش ایسوسی ایٹڈ ٹی سنڈیکیٹ کے لئے فائدہ مند ثابت ہوگی۔ ہماری آمدنی بڑھ جائے گی۔ کیوں ہے نا؟"

"ہاں!"

"ایشور اپنی دیا بارش کے ذریعہ بھیجتا ہے۔"

"ہاں — دیا..... آمدنی — ارے ارٹا کی جھونپڑی کی کھپریل اُڑ رہی ہے"

"ایشور کی دیا....."

اب بارش بہت زیادہ ہونے لگی ہے۔ گویا سب کی سب ابوبکر روڈ پر ہی برس پڑے گی۔ نگٹیمر کے پتے بطخ کے پروں کی طرح بھیگتے نہیں۔ پانی کے قطرے ان پر پارے کی طرح

ڈھلکتے ہیں۔ کہیں کہیں اٹک کر ایک مدور ہیرے کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ دیر بعد ایک اور قطرہ وہیں ٹپکتا ہے تو ہیرا زیادہ مدور اور بڑا ہو جاتا ہے۔ مگر نازک نازک رات کی رانی کے پھول اس بوچھاڑ کی تاب نہیں لا سکتے .... ابوبکر روڈ کے دو رویہ کوٹھیوں میں بسنے والے کیکٹس کے پتوں کی طرح ہیں۔ بارش ان کی سلیٹ کی چھتوں پر سے بہتی ڈھلکتی ہوئی ابوبکر روڈ پر آ رہی ہے۔ بارش کے قطرے ان کے لئے مدور ہیرے ہیں ...... مگر رات کی رانی ـــــ رانا، سر جھٹک دیتی ہے لگتا ہے سر اٹھا کر کھپریل کو باندھنا شروع کر دیتی ہے۔ اور اپنے بھیگے ہوئے بالوں کی وجہ سے بوگن ویلیا کی حسین بیل دکھائی دیتی ہے۔

پہلے بچاری نشگی گھوڑی کو ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ اب یہ اس کے لئے ایک نئی مصیبت ہے۔ جھونپڑی کی تمام چھت سے پانی بہنے لگا ہے۔ برسنے کی اور بھی تو محض رسمی پناہ ہے اس کے تمام کپڑے بھیگ کر جسم کے ساتھ چپک گئے ہیں۔ شام کے اندھیرے میں جب بجلی چمکتی ہے تو وہ عریاں سی دکھائی دیتی ہے۔

بارش میں اشعد کی دیا ہے کوئی نرم و گرم کپڑے زیب تن کرتا ہے تو کوئی عریاں ہو جاتا ہے کسی کی آمدنی دوگنی بڑھ جاتی ہے تو کسی کی کھپریل ٹوٹ جاتی ہے ...... کوئی شب عید گزارتا ہے کوئی شب تنور!

بوگن ویلیا کی بیل کو جب تند ہوا ہلاتی ہے تو یوں دکھائی دیتا ہے۔ گویا کوئی حسینہ سر دھونے کے بعد لب بام اپنے چمکیلے سیاہ بالوں کو زور سے جھٹک کر دونوں ہاتھوں سے چھانٹتی ہے رانا کا بے عقل، کاہل ـــــ پاگل لڑکا جھونپڑی میں سویا پڑا ہے۔ بجھتے ہوئے چولہے کے پاس گرم ہو کر ـــــ اگر وہ جاگتا ہوتا تو نشگی گھوڑی پکڑنے کے لیے اس کی ماں

کو میرا مہورت منت نہ ہونا پڑتا...... پھر اپنا لال تو چلا ہی گیا ہے۔ کاش! وہ کاہل لڑکا ہمیشہ کی نیند سو جائے!

شاید رانا کھپریل بندھوانے کے لئے ہمیں بلائے۔ اس کے بارش کی وجہ سے بدن کے ساتھ چپکے ہوئے کپڑے، بجلی کی چمک میں اس کا بدن کتنا خوبصورت اور سڈول دکھائی دیتا ہے لیکن ماں...... ماں کہتی ہے کل جگ ہے۔

کلکتہ کی مارکٹ میں چائے کتنی بکے گی؟ کتنی وساور کو جائے گی۔ میری آمدنی بڑھ جائے گی۔ پاشر کی بھی...... لیکن وہ کم بخت بیڑیاں پیئے گا۔ چائے کے پیالوں کے پیالے اور شراب اور......

"تجھے نکلے گلٹی ہیضے کے توڑے...... سویرے کا سویا رہ جائے تو......" رانا اپنے مجھوکے کو گالیاں دیتی ہے۔

رانا کو چائے کی ضرورت نہیں، گالیاں دیتے ہوئے اس کے جسم میں کافی گرمی آ گئی ہے۔ وہ نکما، سست لڑکا، اس کے ساتھ کھپریل بھی تو نہیں بندھواتا۔ آرام سے بجھتے ہوئے چولھے کے پاس پڑا رہتا ہے۔ پانی کی چھینٹیں پڑتی ہیں تو ٹانگیں سکیڑ لیتا ہے جب اندر پانی ہی پانی ہو جائے گا تو وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھے گا۔ صرف یہ کہے گا۔ ماں کیا بات ہے جو اتنا شور مچا رکھا ہے؟ چین سے سونے بھی نہیں دیتی...... جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ وہ تو شاید یہ بھی کہے: میں ایسی عورت کے گھر کیوں پیدا ہوا جو ایسی گالیاں دیتی ہے۔ جیسے میری کوئی ضرورت نہیں۔ کہتی ہے سویرے کا سویا رہ جائے۔ تو...... وہ یہ تو کیا جانے کہ جب ماں یہ کہتی ہے کہ تو سویرے کا سویا رہ جائے تو اس وقت وہ اسے ہمیشہ کی نیند سے بچانے کے لئے طوفان باد و باراں میں تن تنہا بے یار و مددگار اپنی جان تک لڑا دیتی ہے

ابھی انتہائی گرسنگی کی وجہ سے اس کی مشکی گھوڑی ہنہنا رہی تھی۔ جیسے سکندر سے جدا ہونے پر بوسی فیلس ہنہناتا تھا۔ مگر اب وہ خاموش ہے۔ شاید اس نے راٹا کی بے بسی کو دیکھ لیا ہے۔ اور پھر ایا کے پیار کو ـــــ اب وہ کبھی نہیں ہنہنائے گی۔

پرامشر بولا: "وہ ایک مرتبہ مدد کے لئے اشارہ تو کرے؟"

"ہاں ـــــ اور ہم دونوں ......" میں نے جواب دیا۔

"میں کہتا ہوں۔ کیوں نہ ہم خود ہی چلے جائیں؟"

"مگر ماں کہتی ہے۔ کل جگ کو صرف پانچ ہزار برس گذرے ہیں۔ رام جانے ابھی کتنے باقی ہیں۔"

پھر وہی گالیاں ......

"تجھے آوے ڈھائی گھڑی کی ...... نکلے تیرا جنازہ اٹھاتا دا ...... گور میں پڑے ...... موئی نکھٹو کے تو ......"

شاید وہ چھوکرا سوچتا ہوگا۔ میں کیوں اس عورت کے گھر پیدا ہوگیا جو مجھے گور میں بھیجنا چاہتی ہے۔ وہ بیوقوف کیا جانے کہ حقیقت میں وہ اسے اپنی گود سے بچانے کے لئے اپنی جان تک لٹا رہی ہے۔ وہ دس سال سے بے عمل، غافل، کاہل پھر کر اب تک اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ صرف اس لئے کہ راٹا کو اس سے محبت ہے۔ جس کا اس جوانا مرگ کو اچھی طرح سے احساس ہے۔ وہی راٹا کی زندگی کا سہارا ہے۔ وہی اس کی آنکھوں کا نور ہے۔ اسی لئے تو وہ بے کس و در اندھی ہے...... اگر راٹا پھر ایا لال سے محبت نہ کرتی۔ اگر وہ اس چھوکرے پر اپنی تمام امیدیں نہ لگا دیتی تو سکھی ہو جاتی۔

البتہ ٹھٹھرک ہو کر کوئلے کی کان میں جاتی ہوئی دکھائی دیتی۔ بہاؤ کے خلاف ایک دہقان بھیگتا ہوا آہستہ آہستہ اسی جانب آرہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیل کی رسی ہے۔

شاید وہ بیل کو کہیں سے چرا لایا ہے۔ غالباً اس کی خواہش ہے کہ ہم اسے برآمدے میں کچھ دیر ٹھہرنے کے لئے جگہ دیں، اور یہ ممکن نہیں، کون جانے بیل گوبر سے برآمدے کا فرش خراب کر دے۔ اور ہاں..... پھر چوری کے مال کو اپنے پاس رکھنا.....

"بابو جی سلام" دہقان بولا

"سلام!" پراشر نے زیرِ لب کہا۔

پھر وہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں سے ایک گیلا کاغذ پراشر کے ہاتھ میں دے دیتا ہے —— پروانہ راہداری ..... یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بیل چوری کا مال نہیں، اپنا ہے، جسے وہ تال محل کی منڈی میں بیچنے کے لئے جا رہا ہے۔

باعث تحریر آنکہ

ایک راس گاؤ نر، جس کے سینگ اندر کو مڑے ہوئے ہیں، دُم کے سیاہ بالوں میں سفید......

—— اور باقی کا بارش نے دھو دیا ہے۔ کتنے بے ربط ہوتے ہیں یہ دہقان لوگ۔ پہلے سینگ اور پھر دُم —— ان کے لئے گویا دُم اور سینگوں کے درمیان کوئی جگہ ہی نہیں۔ جسم کا رنگ پہلے آنا چاہئے تھا، مخملیں جسم، جو بارش میں گیلا ہو کر سفید ساٹن کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ اندھیرے میں اس کا سفید رنگ نظر آتا ہے۔ مگر جب بجلی چمکتی ہے تو بیل بجلی کا ایک جزو بن جاتا ہے..... بیل تمام زور لگا کر ہانپتا ہے۔ جیسے شوجی مہاراج کو دیکھ کر پیار سے ان کا نندی گن ہانک رہا ہو۔ بیل صبح سے بھوکا ہے۔ مگر اپنے بوڑھے، کروڑ گل مالک کو پیار کیے جاتا ہے۔ اگرچہ عقلِ حیوانی سے جانتا ہے کہ بوڑھا کل اسے تال محل کی منڈی میں بیچ ڈالے گا۔ ہائے! یہ محبت اور جنون کے انداز بھی کیسے چھپتے ہیں؟

"کیوں بیچتے ہو اتنے خوبصورت بیل کو؟"

"بابو جی فصلیں تباہ ہو گئی ہیں..... اور مالیہ دینا ہے..... اُف! یہ بے وقت کی بارشیں۔ کیا میں اندر آ جاؤں، اس چھت کے نیچے؟"

"اونہوں — تمہارا یہ بیل گوبر سے برآمدے کو خراب کر دے گا!"

"میں صاف کر دوں گا بابو جی! — شیشے کی طرح..... بیل صبح سے بھوکا ہے۔ اتنی سردی کہاں برداشت کرے گا۔ اور پھر دوسری بات نہیں فقط یہ پروانہ راہداری دھل گیا، تو یہ بیل چوری کا مال سمجھا جائے گا۔ تال محل کا تھانے دار جہان خان بڑا کڑوا آدمی ہے۔ مار مار کر ادھ موا کر دے گا۔ بیل جاتا رہے گا۔ تال محل میں اس بیل کی قیمت پر ہی تمام امیدیں لگا رکھی ہیں..... ہائے یہ بے وقت کی بارشیں....."

"جاؤ" پراشر نے کہا..... "ہم تمہیں یہاں جگہ نہیں دے سکتے..... جاؤ....."

دہقان سہم کر چلا گیا۔ کبھی کبھی پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا۔ گویا رات کو ہمارے ہاں ہی سیندھ لگائے گا۔ "اگر وہ سیندھ لگائے بھی تو حق بجانب ہے" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

بیل الو بکہ، وڈ کے چوک میں گر پڑا ہے، وہ دہقان کے اٹھائے..... کسی کے اٹھائے نہ اٹھے گا۔ وہ نندی گن کی طرح دہقان کو دیکھ کر کبھی ہانک نہیں لگائے گا۔

پھر میں نے پراشر سے کہا۔ "چائے تیار ہے بھائی — کتنی پیالیاں پیو گے؟"

"چھ!"

"پارہ ٹر..... اور درجن بیڑیاں؟ کہو وہاں"

"زیادہ!"

"بھی!"

—— بارش اور بھی تیز ہو رہی ہے اور…… اور راٹا کی گالیوں کی بارش بھی!
راٹا کی کھپریل گر چکی ہے۔ دیواروں میں شگاف ہو گئے ہیں۔ قریب ہی ایک سیٹھ کے سہ منزلہ مکان کا پرنالہ راٹا کی جھونپڑی پر گرنے لگا ہے۔ جھونپڑی کے ارد گرد اور بجری روڈ پہ چلتے ہوئے پانی کو دیکھ کر طوفانِ نوح کا خیال آتا ہے۔ کیا ہم راٹا کی مدد کر سکتے ہیں؟ باوجود کل جگ کے…… ہمارے برآمدے کے سوا اور کوئی نزدیک پناہ بھی تو نہیں ہے۔ پراشر خوش ہے۔ اس کے پاس چائے ہے، بیڑیاں ہیں…… اور بے پناہ راٹا اِدھر آ ہی جائے گی۔"

راٹا چاروں طرف دیکھ رہی ہے۔ پراشر کہتا ہے:۔
"ابھی وہ کہے گی۔ مجھے اپنے دامن میں چھپا لو، بابو جی"۔
"کبھی نہیں۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"تو اس کے سوا اسے چارہ ہی کیا ہے؟"
"یہ بارش کا دامن کیا اس کے لئے کم ہے؟ راٹا کی سی عورت کو میں جانتا ہوں۔ جب کسی ایسے انسان پر عزت کے دامن تنگ ہو جاتے ہیں،…… تو خود بخود ایک بہت بڑا دامن اس کے لئے کھل جاتا ہے……؟"

—— اور راٹا کی تو مٹھیاں بند ہیں۔ کبھی کبھی وہ دانت پیستے ہوئے چیختی ہے۔
"جوان مرے…… کلموئے…… میں نے تو رو لیا تجھے بے چین!"

حیاتین "ب"

ایجرٹن روڈ کے عین وسط میں جہاں جلی حروف میں "روڈ اپ" لکھا ہوا تھا اور نصف درجن کے قریب سُرخ پھریرے ہوا میں لہرا رہے تھے میں بطور ایک چھوٹے اوورسیئر کے مزدوروں کے کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک بہت لمبا ٹیپ تھا۔ جس سے بار ہا مجھے مرمت طلب سڑک اور کٹی ہوئی روڑی کی پیمائش کرنی پڑتی تھی۔

"روڈ اپ" بورڈ کے پاس ہی کولتار کے چند خالی پیپے پڑے تھے اور ان میں سُرخ شیشوں والی بتیاں رات کے وقت استعمال کے لئے اقلیدسی نصف دائرہ میں پڑی تھیں۔ قریب ہی پگڈنڈی میں چند گہرے سے گڑھے نظر آ رہے تھے۔ ان گڑھوں کو بطور چولہے کے استعمال کرتے ہوئے سڑک کے مرمت شدہ حصے پر بچھانے کے لئے کولتار کو گرم کیا جا

رہا تھا۔ اور دوسرا ایک چیختا چلاتا ہوا انجن بچھی ہوئی کنکریوں کو دبا رہا تھا۔

پھریروں اور خالی ٹینوں کے ساتھ ہی چند مارواڑی اور پوربی عورتیں سڑک کے مرمت طلب قطعۂ زمین کو بڑے بڑے برشوں سے صاف کر رہی تھیں اور اپنے مخصوص زبان سے گا گا کر کام میں رُوح پھونک رہی تھیں۔ پاس ہی سول لائن کے تھانے اور ایک بڑی سی نرسری کے درمیان ایک لسوڑے کے نیچے دو ایک بچے بلک رہے تھے۔ نرسری میں چند ایک چھوکرے غلیلیں اور گوپھیے ہاتھوں میں لئے ثمرآور پودوں سے طوطوں وغیرہ کو اڑا رہے تھے۔ کنکری چھوڑتے وقت وہ بلند آواز سے "اللہ اکبر" پکارتے کبھی کبھی بے وجہ چیختے زور زور سے ہنستے اور اپنی آواز کی گونج سے حظ اٹھاتے۔ میری توجہ نرسری کی طرف لسوڑے کے نیچے بلکتے ہوئے بچوں کی طرف منعطف ہو گئی۔ بچوں کے پیٹ پھولے ہوئے تھے اور ان کی چھاتیاں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ جب کوئی مارواڑی یا پوربی عورت اپنے بچے کو دودھ پلانے کے لئے اٹھتی تو ٹھیکیدار عرفانی خشم آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگتا۔ مگر جیسے ہی پس پشت گڑگڑاتا ہوا انجن سیٹی دیتا، عرفانی اُچھل کر انجن کی زد سے باہر پٹڑی پہ کھڑا ہو جاتا۔

اس دفعہ ٹھیکیدار عرفانی نے ٹنڈر بہت کم رقم کا بھرا تھا۔ اس لئے مزدوروں پر سخت نگرانی تھی۔ سستانا، گڑگڑی کے کش لگانا، دن میں دو دفعہ سے زیادہ پیشاب کے لئے کام کو چھوڑنا قواعد کے خلاف تھا۔ بچوں کو ایک دفعہ سے زیادہ دودھ پلانے کی اجازت نہ تھی۔ مادیت کے پھلنے پھولنے یا پیدائش کی شرح کا کسی کو خیال نہ تھا۔ اور نہ حکومت کی طرف سے کوئی آسائش مہیا تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بلکتے ہوئے بچے بھوک سے نڈھال ہو کر مر جائیں گے۔

جمعدار رام اوتار کی مدد سے میں گیلی مٹی پر پڑی ہوئی روڑی کو ناپنے لگا۔ روڑی ساڑھے تین فٹ چوڑی آٹھ فٹ لمبی اور ایک فٹ گہری تھی۔ اور میرے اندازے کے مطابق ایک بڑے سے بیضوی گڑھے کے لئے کافی تھی۔ اس وقت میں نے ماتا دین کو اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہو کر سستانے کی خاطر بیٹھتے دیکھا۔ ماتا دین ایک ادھیڑ عمر کا پوربی مزدور تھا۔ ذات اس کی کوری تھی۔ جسم کے لحاظ سے وہ باقی مزدوروں سے کہیں اچھا تھا۔ دھوپ میں ماتا دین کا پسینے سے شرابور سیاہ رنگت کا عریاں تنومند جسم ایک بڑے کانسی کے مجسمے کی مانند دکھائی دیتا تھا۔

ماتا دین کو اس حالت میں دیکھ کر میں نے ٹیپ کو جمعدار رام اوتار کے حوالے کیا اور روڑا پ، کو پھلانگ کر ماتا دین کے پاس جا پہنچا اور بلند آواز سے چیخا:

"ہے..... ماتا دین!"

ماتا دین گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور اپنی خمار آلود نگاہیں مجھ پر ڈالتے ہوئے بولا: "مالک!"

"ہاں! مالک..... آرام کر رہے تھے نا؟..... شاید تم عرفانی کے مزاج سے اچھی طرح واقف نہیں ہوئے!"

"رات بھر جاگتا رہا ہوں۔ اس لئے ذرا......"

"یہ کوئی وجہ نہیں۔"

ماتا دین ایک عجیب انداز سے مسکرا کر اپنے کام میں مشغول ہو گیا، اس کے بد شکل پھیلے ہوئے مسوڑھے پھیل کر بڑے بڑے گھناؤنے دانتوں کو گویا چھوڑ رہے تھے۔ وہ روڑی کوٹتے ہوئے بولا:

"کام چور نہیں ہوں مالک..... آپ جانتے ہیں میں آرڈ دوٹکیوں میں کام کیسے چلاتا

ہوں مگر......؟

ماتا دین ایک ایماندار مزدور تھا۔ وہ باقی مزدوروں سے زیادہ ذہین تھا۔ اسے دوبارہ بات سمجھانے کی ضرورت کبھی نہیں پیش آتی تھی۔ صبح جب اسی ٹریک پر سورج کی پہلی ٹکیہ مشرق کی طرف نرسری کے چھوٹے چھوٹے درختوں کے پیچھے سے نمودار ہوتی، اس وقت سے لے کر شام تک جب کہ دوسری ٹکیہ مغرب کی طرف شہر کے مکانوں کے بے ربط منڈیروں کی طلائی مغزی ادھیڑتے ہوئے ڈوب جاتی، وہ دو ٹکیوں میں برابر کام کئے جاتا۔ اسی اثنا میں گرد و غبار سے سینہ صاف کرنے کے لئے ماتا دین کوڑی بھر پشاوری گڑ کھاتا۔ اور چھپ کر ایک آدھ گڈگڑی کا کش لگاتا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اسے دم لیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

عرفانی نظر سے اوجھل کھڑا تھا۔ اپنی ذمہ داری کا احساس دلانے کے بعد میں نے ماتا دین سے پوچھا:

”عرصہ سے من بھری ان عورتوں میں دکھائی نہیں دیتی.... اچھی تو ہے نا؟“

”اجی کہاں اچھی ہے۔“ ماتا دین بولا ”اسی کے لئے تو رات کو جاگنا پڑتا ہے اور دن کو میری یہ دُشا ہوتی ہے۔“

مجھے ایک مخدوش سے قطعۂ زمین کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ٹریک کے ایک دم مغرب کی طرف مڑ جانے کی وجہ سے انجن کے پہیے پہنچنے سے قاصر تھے۔ مگر میری توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے ماتا دین بولا:

”مالک.... اسے بیری بیری ہو گئی ہے۔ شاید مجھے یہ نوکری چھوڑنی پڑے۔“

”بیری بیری ہے؟“ میں نے اپنے شانوں کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا ”میں نہیں جانتا

بیری بیری کیا ہوتی ہے؟"

ماما دین بولا۔"آپ بیری بیری بھی نہیں جانتے..... آپ سے پڑھے لکھے آدمی نہ جانیں گے تو اور کون جانے گا؟"

——اور ایک مستعار سی مسکراہٹ ماما دین کے چہرے پر لڑھکنے لگی۔ اس نے اپنی لپٹی ہوئی دھوتی کے ایک پلّے کو کمر سے نکالا اور کپڑے کی کئی تہوں میں سے کاغذ کے ایک خستہ ٹکڑے کو برآمد کرتے ہوئے میرے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ لال بی بھارتی جی خیراتی ہسپتال کی تشخیصی پرچی تھی۔ مرض کا نام بیری بیری لکھا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ پٹھوں میں ورم ہو جانے کو بیری بیری کہتے ہیں، اور یہ مرض خوراک میں حیاتین 'ب' کے کافی مقدار میں موجود نہ ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔

"تو کیا من بھری کے پٹھوں میں ورم ہو چکے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

ماما دین نے انگوٹھے اور انگلی سے ایک بڑے سے سوراخ کی شکل پیدا کرتے ہوئے کہا۔"اِتنے بڑے..... سرکار"

میرے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

ماما دین کہنے لگا۔" اسے کمبخت اچھی نہیں لگتی..... ڈاکٹر کی رپٹ دیکھی ہے نا آپ نے؟ اس نے گوشت، مانس، انڈے، مکھن اور پنیر کھلانے کے لئے کہا ہے"

اس وقت میں سوچنے لگا۔ بھلا روکھی سوکھی دال چپاتی میں سے من بھری کیونکر حیاتین 'ب' اخذ کر سکتی ہے۔ اگرچہ کوری، اکری اور نیچ ذات کے پوربیا اکثر گوشت کھا لیتے ہیں۔ مگر ماما دین پٹھوں کا نرم نرم گوشت، انڈے، مکھن، پنیر، ٹماٹر اور اس قسم کی امیرانہ خوراک کہاں سے مہیا کرے گا۔ جہاں تک میرا خیال تھا اس نے آج تک سبزی بھی استعمال

نہ کی تھی اور اپنے گاؤں کے کسی بھائی بند کے ہاتھ مسور کی دال گھوا رکھی تھی، جسے وہ صبح و شام کھاتا تھا۔ تبھی تو اسے دانتوں کی سکروی (SCURVY) لگی تھی۔ سکروی، خوراک میں حیاتین سی، کے مفقود ہونے کا نتیجہ ہے۔ اس کے مسوڑے بہت زیادہ پھول کر ٹیڑھے میڑھے دانتوں کو چھوڑ رہے تھے۔ میں نے کہا، خواہ کسی ماتا دین یا گنگا دین کی جورو من بھری سے زیادہ خوبصورت ہو اور کوئی اس کے لئے ماتا دین سے زیادہ جفاکشی کرے، مکھن، پنیر کی سی خوراک مہیا نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد میں اس ڈاکٹر کی حماقت پر ہنسنے لگا، جس نے بیری بیری کا نام ماتا دین کے ذہن نشین کرا دیا تھا اور اس قسم کی خوراک بطورِ علاج لکھ دی تھی۔ ماتا دین کے بیان کے مطابق ڈاکٹر کا اپنا رنگ شنگر بھی (شنگرفی) ہو رہا تھا۔ کوئی جانے گھونس پیٹ کر باہر آ جائے گا۔ ڈاکٹر نے ماتا دین کو وہ دوائی کی بوتل بھی دکھائی تھی جس میں حیاتین ب کا جزو کافی مقدار میں موجود تھا۔

یکایک مجھے یاد آیا۔ ماتا دین کام چھوڑنے کے متعلق کہہ رہا تھا۔ میں نے پوچھا:

"تو یہاں سے کام چھوڑ دو گے ..... کہاں جاؤ گے ماتا دین؟"

"چھاؤنی میں مالک! ..... وہاں ڈنڈی دار کے پاس ملازم ہو جاؤں گا۔ ڈنڈی دار تمہاری طرح مہربان ہے۔"

پھر ماتا دین نے بتایا کہ ایجرٹن روڈ اور رایبٹ روڈ کی مرمت سے پہلے جبکہ لاٹ صاحب کا دفتر بن رہا تھا وہاں ماتا دین اور من بھری کام کر رہے تھے، ڈنڈی دار اُدھر آ نکلا۔ دھوپ میں بیٹھی ہوئی من بھری کو دیکھ کر ماتا دین سے بولا "اس بچاری کو کیوں تکلیف دیتے ہو، میرے ساتھ چھاؤنی چلو، سٹور میں بہت سے قلی چاہئیں۔ تمہیں رکھ لیں گے، پیسے اچھے مل جائیں گے۔"

پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا:

"اس نے کھوراک دینے کا بھی وعدہ کیا مالک ۔ ۔ ۔ اسٹور میں کام کرنے والے ڈنڈی دار آنکھ بچا کر وہاں سے بہت کچھ اُڑا سکتے ہیں ۔ میس (MESS) میں سے پھر انڈے وغیرہ بھی لے سکتے ہیں ۔ کم از کم راشن میں سے تو کچھ نہ کچھ ان کے پلّے پڑ ہی جاتا ہے"

میں نے سوچا، شاید ماتا دین کو وہاں سے حیاتین 'ج' بھی مل سکیں اور اس کی سکروی بھی دُور ہو جائے ۔ میس میں کابراگوبھی، اکرم کلا، شلجم، زلم ترئی سبھی کچھ آتا ہے ۔

ایک محنتی مزدور کو کھو دینے پر ضرور رنج ہوتا ہے ۔ مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ ماتا دین کو کسی صورت بھی اس کے ارادہ سے باز رکھوں ۔ کون جانے من بھری کی بیری بیری کا علاج ہو جائے اور پھر وہ بھی 'سنگریبی' ہو جائے ۔

چند دنوں بعد میں عرفانی کا معتبر ملازم ہو گیا ۔

ایک پرانے قبرستان میں ہمارے بزرگوں کی ہڈیوں اور ایک مسمار سی گڑھی کے کھنڈرات میں سے ایک سرکاری عمارت آہستہ آہستہ سر اٹھانے لگی ۔ میرے ہاتھ میں وہی پرانا ٹیپ تھا بسا اوقات مجھے بنیادوں کے اندر گھس کر کھدائی کی پیمائش کرنی ہوتی اور کبھی کندہ کاروں اور سنگتراشوں کے کام کا جائزہ لینا ہوتا ۔

عرفانی نے تمام بچوں والی عورتوں کو کام سے علیحدہ کر دیا تھا ۔ جو عورتیں ملازم رکھی گئی تھیں وہ پیسے کم لے کر مردوں کے برابر کام کرتی تھیں ۔

جب سرکاری تعمیر کی چھت پر سِل ڈالنا پڑا تو چند ایک مزید مزدوروں کی ضرورت لاحق ہوئی ۔ یہ کام عرفانی نے میرے سپرد کیا ۔ مجھے چند محنتی اور دیانتدار مزدوروں کی ضرورت تھی ۔ میں نے جمعدار رام اوتار سے ماتا دین کا پتہ پوچھا تو جمعدار نے مشکوک نگاہوں سے

سے میری طرف دیکھا اور پھر ہنستے ہوئے ماتا دین کا پتہ بتا دیا اور میں اس کی تلاش میں چھانی جا پہنچا۔

شام کا وقت تھا۔ صدر بازار کی بجلیاں ابھی روشن نہ ہوئی تھیں۔ ایک گہرا دھواں مزدوروں کی گنجان بستی لال کرتی اور فالوور لائنز پر چھایا ہوا تھا۔ اور وقت سے پہلے تیرگی پیدا کر رہا تھا۔ بڑی دقت کے بعد مجھے ماتا دین کی جھونپڑی ملی۔ ایک بیٹھے ہوئے چھپر کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا اور جھونپڑی میں ماتا دین گڑگڑی سلگا تمباکو پی رہا تھا۔ ایک خاص قسم کی بو سب طرف پھیلی ہوئی تھی، ماتا دین کے قریب ایک رکابی میں کوڑی بھر مکھن پڑا تھا۔ المونیم کی ایک تھالی میں ایک بڑا سا گوبھی کا پھول رکھا تھا اور پھول میں سے ایک گنڈی کچھ چپ چپا، لسلسا سا لعاب اپنے پیچھے چھوڑتی ہوئی تھالی کے کنارے کنارے رینگ رہی تھی۔

جائیں رج، ’سے تھی ایک مسکراہٹ، ماتا دین کے ٹیڑھے میڑھے دانتوں اور پھولے ہوئے مسوڑھوں کو دکھانے لگی عین اس وقت جھونپڑی کے اندر سے کراہنے کی آواز آئی۔

میں نے جھونپڑی کے اندر ایک تاریک سے کمرے میں جھانکا، اس کمرے میں من بھری پڑی تھی۔ وہاں ہوا اور روشنی کی پہنچ نہ تھی۔ میں نے کہا، مہربان ڈنڈی دار کی مہربانی سے من بھری کو خوراک تو اچھی مل جاتی ہے۔ ممکن ہے اسے بیری بیری سے نجات حاصل ہو جائے تو بھی اس قسم کی فضا میں ضرور وہ کسی اور خوفناک بیماری کا شکار ہو جائے گی۔ دنیا میں خوراک ہی سب کچھ نہیں، روشنی بھی تو ہے کھلی ہوا ہے ...... اور دق ہے!

یک لخت روشنی سے اندھیرے میں چلے جانے پر مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ پھر آہستہ آہستہ من بھری کا سہما ہوا چہرہ اور مصلوب جسم نظر آنے لگا۔ اپنے کتابی اور سنگِ یشب کی طرح

نعد چہرے کے ساتھ من بھری ہو بہو اس مصری لاش کی مانند دکھائی دیتی جس پر ابھی ابھی حنوطی عمل کیا گیا ہو اور جسے نسلوں تک محفوظ رکھے جانے کے لئے ممی میں اتارا جاتا ہو۔

ماتا دین نے گڑگڑی کا ایک لمبا کش لگایا، اور برتن میں سے منڈی نکال کر باہر پھینک دی۔ گوبھی کو چیرا، اور مصالحہ بھونتے ہوئے اسے تسلے میں ڈال دیا۔ اس نے بتایا کہ اس کی جورو کے بیمار ہونے کی وجہ سے ڈنڈی دار اسے بہت کم کام دیتا ہے تمام قلی افسروں کی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ مگر اسے افسروں کے نزدیک جانے کا کام ہی نہیں دیا جاتا۔ اسٹورکیپر، ڈنڈی دار کا سگا ماموں ہے، راشن میں سے سب کچھ مل جاتا ہے۔ آخر ڈنڈی دار کتنا اچھا آدمی ہے، ایسے چند آدمیوں کے سہارے ہی تو دنیا جیتی ہے۔

پھر میرے قریب آتے ہوئے ماتا دین بولا "ایک کھسی کی کھبر سناؤں مالک؟"

اور پھر میرے کان کے قریب منہ لاتے ہوئے بولا "وہ امید سے ہے"

ماتا دین کے بیان کے مطابق ساڑھے تیرہ برس بیاہ کو آئے تھے اور اس وقت تک اولاد کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ میری دانست میں تو یہ ماتا دین کی خوش قسمتی تھی، غریب طبقہ کے لوگ عموماً کثرتِ اولاد سے نالاں ہوتے ہیں، ان کے لئے تو ایک بچہ بھی بوجھ ہو سکتا ہے۔ مگر ماتا دین خوش تھا۔ میں نے سوچا شاید من بھری پہلے سے بھی زیادہ بیمار ہو جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بچے کی پیدائش کے بعد اس کی کچھ بیماریاں قدرتی طور پر دور ہو جائیں۔ بہر صورت من بھری کے عرصہ تک بیمار رہنے یا زچگی میں ماتا دین کو اکیلے ہی گھر کا جوا اٹھانا پڑے گا، علاوہ اس کے خرچ بھی دوگنا ہو جائے گا۔

ماتا دین کی اس عجیب و غریب زندگی میں کھو کر میں اپنے کام کو بھی بھول گیا۔ میں نے کہا ڈنڈی دار کی مہربانی سے ان لوگوں کو چاندنی، رب اور رج، دونوں مل جاتے ہیں۔

ان کی خوشی ـــــ بچے کی امید بھی شاید حیا مین اب اکا کرشمہ ہے اور بچے کو بھی اس کے مقدر کا سب کچھ مل جائے گا۔ اب وہ عرفانی کی مزدوری نہیں کرے گا۔ لے پرواہی کیا ہے ۔ میں نے اس کے سامنے مزدوری کا تذکرہ ہی نہ کیا۔ گویا میں اسے یونہی دیکھنے آیا تھا۔

عرفانی کا مال و اسباب شہر میں لے جانے کے لئے چھکڑوں میں سے مذ ایک بیل زخمی تھے، پھر بھی ان سے برابر کام لیا جا رہا تھا۔ انجمن تحفظِ جانوراں کے ایک افسر نے گاڑی بانوں کا چالان کر دیا۔ اس قضیہ کو نمٹانے کا کام بھی میرے سپرد کیا گیا اور میں انجمن کے ایک افسر کو رشوت دینے میں مصروف تھا۔

ایک طرف سے ماتادین ہانپتا ہوا آنکلا، وہ بمشکل پہچانا جاتا تھا۔ اس چند ماہ کے عرصہ میں اس کی شکل یکسر تبدیل ہو گئی تھی۔ اس کے دانت زیادہ گھناؤنے ہو گئے تھے اور اپنے سامنے کھڑے ہوئے آدمی کا چہرہ اچھی طرح دیکھنے کے لئے وہ بار بار آنکھیں جھپکاتا تھا۔ پہلے تو وہ چند لمحات مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر میری آواز کو پہچان کر بولا:

"مالک! ..... رام اوتار کے کہنے پہ یہاں آیا ہوں۔ وہ کہتا تھا۔ آپ کو مجوری چاہئے۔ یرا چھوٹا بھائی آپ کے پاس کام کر ہی رہا ہے۔ مجھے بھی رکھ لو۔"

میں اپنی جگہ پر سے اچھل پڑا۔ بھلا وہ ٹھیکوں میں کام کئے جانے والے ماتادین کو کون مزدور رکھے گا۔ لیکن میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"کیا ڈنڈی دار کا راشن ختم ہو گیا ہے؟"

ماتادین کچھ نہ بولا۔

"کیا تمہیں خوراک نہیں ملتی اب؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

ماتادین آنکھیں جھپکتا ہوا انجمن تحفظ جانوراں کے افسر کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ افسر جان گیا کہ یہ مزدور کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مگر اس کی موجودگی نہیں چاہتا۔ وہ خود بخود وہاں سے ہٹ گیا اور ایک کچی دیوار کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگا۔ ماتادین بولا:

"کیا کہوں مالک!...... ڈنڈی وار نے تو ہماری جندگی برباد کر دی ـــ کسی کی سکل سے کوئی کیا جانے۔ جتنا بدماس تھا جب مجھے کام کرتے ہوئے چند روز ہو گئے تو کہنے لگا قلیوں نے ٹھیکیدار کو شکایت کر دی ہے، پھر بھی میں تمہیں تکلیف نہیں ہونے دوں گا تمہیں سب کچھ گھر پہنچا دیا کروں گا۔ دو تین دفعہ گھر پہنچا تو وہ مجھ سے پہلے وہاں موجود تھا۔"

"تو من بھری کہاں تھی؟" میں نے دم روکتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی اندر تھی...... سیدھی سادھی عورت...... جھانسے میں آگئی، سرکار ہم بھی عزت والے آدمی ہیں۔ جب میں نے کھری کھری سنائیں تو ڈنڈی وار نے کھوراک دینی بند کر دی اور دوسروں سے تگنا کام لینے لگا۔ اپھسر جھڑکنے لگے۔ قلی تنگ کرنے لگے۔ میں نے اس کی نوکری چھوڑ دی اور گودام میں کام کرنے لگا۔"

پھر ماتادین نے اپنا شانہ برہنہ کیا۔ اس پر ایک بڑے سے زخم میں چربی دکھائی دے رہی تھی۔ ماتادین نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا "یہ بعد میں میس کی بوریاں اٹھاتے سے ہوا...... میری جان ہی تو نکل جاتی، اگر میں وہاں سے ملا جمت نہ چھوڑتا...... میں نے بدنامی بھی سہی مالک...... لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔"

انجمن تحفظ جانوراں کا انسپکٹر قریب آچکا تھا۔ میں نے پانچ کا ایک نوٹ اس کی مٹھی میں دیا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ تمام کام ٹھیک ٹھاک کر دینے کا وعدہ دیا۔ اس وقت مجھے من بھری کے ہونے والے بچے اور اس کے مستقبل کے سوا اور کچھ نہ سوجھتا تھا۔ ماتادین کا بدنہ

شاداب بھی میرے سامنے تھا۔ میں نے انجمن تحفظ جانوراں کے انسپکٹر کو تاجدین کا نشانہ دکھاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ کا محکمہ اپنے ظلم کا انسداد نہیں کرتا؟" انسپکٹر صاحب نے جیب میں پانچ کا نوٹ ٹھونستے اور بوٹ پالش کئے ہوئے بوٹ پر چھڑی مارتے ہوئے کہا۔ "چودھری صاحب قبلہ...... وہ تو صرف جانوروں کے لئے ہے"۔۔۔۔ اور میں نے تاجدین کو فوراً بلوا لیا۔

لڑکوں اور شاگردوں کے جیب خرچ سے عرفانی کی نانی ہمنی ایجرٹن روڈ تا قفس قرار دی۔ جیب انجمن کے ساتھ رشوت نہ چل سکی اور ایک دفعہ پھر ایجرٹن روڈ پر روڈاپ کے بورڈ لکھ دیئے گئے۔

پھر نہ سرحدوں میں چند ایک چھوکرے سڑک پر سے کنکر اٹھا اٹھا کر انہیں ہوا میں چھوڑتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ وہ گویا چیخ چیخ کر چھوڑتے ہوئے اونچی آواز سے اللہ اکبر پکارتے سنائی دیتے تھے۔۔۔۔ تاجدین کا چھوٹا بھائی میزنر کام کرنے کے بعد وہ ایک کو تار کے خالی کھمبوں کے پیچھے پڑا رستم نے ٹانگہ روڈاپ کر کے پلا لگتے ہوئے میں اس کے پاس پہنچا

میں نے چلاتے ہوئے کہا: "ہے...... میزنر!"

میزنر گھبرا کر بولا "مالک!"

"ہاں...... مالک!" میں نے کیا اسستار ہے تھے نا؟ اور تاجدین کہاں ہے جس کی

کی چار دن سے غیر حاضری لگ رہی ہے؟"

میزنر نے دبی آواز سے کہا...... "تاجدین حوالات میں ہے سرکار!"

——میں اپنی جگہ پر سے اچھل پڑا۔ "حوالات میں؟"

منیر نے بتایا کہ ماتادین نے ایک ڈاکٹر کے ہاں چوری کی اور بھاگ نکلا۔ نیند کی گولی پلائی۔ بعد میں پکڑا گیا۔ پولیس آئی تو وہ گھر میں ملا۔ بجائے اس کے اس سے پہلے زخمی من بھری بھاگ چکی تھی ---- میں سب کچھ سمجھ گیا۔ میں نے گھوم کر کام کرتی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھا۔ مجھے وہ سب کی سب بیمار دکھائی دینے لگیں، گویا انہیں ٹی بی سے ورم ہو رہا ہو۔ میرے تصور میں من بھری کا سانگ، شب کی طرح زرد چہرہ ظاہر ہو گیا۔ مجھے ماتادین سے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ میں حوالات میں گیا تو دیکھا کہ ماتادین مسکرا رہا تھا اور اس کی مسکراہٹ مستعار نہ تھی۔ اسے اپنی قید کی رتی بھر بھی پروا نہ تھی۔ وہ خوش تھا کہ اس کے ورم درست ہو جائیں گے۔ وہ خوش تھا کہ منیر کے ہاں وہ آرام سے رہ کر ایک تندرست بچہ کو جنم دے گی

مگر ماتادین کیا جانے کہ شدت غم سے من بھری کا حمل گر چکا ہے۔ وہ منیر کے بازوؤں میں زندگی کے آخری سانس لے رہی ہے۔ ۔۔۔ خون سے منیر کی جھونپڑی کی زمین رنگین ہو رہی ہے!

لچھمن

لچھمن نے کنوئیں میں سے پانی کی سترھویں گاگر نکالی، اس دفعہ پانی سے بھری ہوئی گاگر کو اٹھاتے ہوئے اس کے دانتوں سے بے نیاز جبڑے آپس ہی جم گئے۔ جسم پر پسینہ چھوٹ گیا۔ اس نے داہنے ہاتھ سے نندو کی بہو ـــــ گوری کی گاگر کو تھاما اور چرخی پر اٹی ہوئی رسی کو دوسرے ہاتھ سے اتارا۔ ایک دفعہ چرکسی اور ہم وہ جا سے تیس فٹ گہرے کنوئیں میں جھانکا۔ اپنے شانوں کو جھٹکا دیا۔ جبڑوں کو دبایا تو گال کچھ پٹھوں سے گئے۔ لچھمن نے پھر غور سے اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو دیکھا۔ ہتھیلی میں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ انگلیوں کے نیچے آج کچھ نئے نئے سُرخ سے نشان بن رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ نشان آج دوپہر تک اُبھرتے ہوئے ایذا رساں آبلے بن جائیں گے اور شہد دھ کی کھیر کھانے کے لئے اس کی انگلیاں یکجا نہ ہوسکیں گی۔ تاہم نصرت کی ایک ہلکی سی سُرخی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

اس نے کالکھ گرداھم کی ان بہو بیٹیوں کی طرف دیکھا اور ہانپتے ہوئے بولا:

"رام ٹھاکر...... آج شرادھ ہے کس کا؟"

نندو کی بہو آگے بڑھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے گھونگھٹ کو چوٹی کی طرف کھسکایا کولہے پر سے دھوتی کا پلو سرک گیا۔ اس نے احتیاط سے ایک ہاتھ سینہ پہ ڈالا اور لجاتی ہوئی بولی:

"میرے باوا کا ...... اور کس کا ہوگا؟"

—— اور پھر سب عورتیں لچھمن کی تعریف کرنے لگیں —— "بہت بھاونا آدمی ہے لچھمن رانکھور ہے نا!" دوسری بولی: "لچھمن کا بیاہ ہوگا۔ میں اس کی گھوڑی گاؤں گی۔ گھوڑی کی باگ تھاموں گی۔ جوڑا گاؤں میں اس کی ماں کے میکے ہیں۔ میری ماں کے میکے بھی جوڑا گاؤں میں تھے۔" "ہے لچھمن کی بہن ہوتی نا۔" اور ایک کہنے لگی: "مجھے تو بھاوج کا رشتہ ہی پسند ہے۔ میں اس کی آنکھوں میں سلائی ڈالوں گی۔ میری گاگر بھری تو کیا احسان کیا؟ دیور بھابیوں کے سینکڑوں کام کرتے ہیں۔" "گوری بہو اچھے پوہ کٹی سا ہاتھ نکلے۔ گلابی سی سرخی ہو۔ بڑا مزا رہے گا۔ اس سال نہیں ہو تو جلدی کا ہے کی ہے۔ لچھمن بھائی کوئی بڈھا کھوسٹ تھوڑے ہی ہو گیا ہے......"

—— اور لچھمن کی عمر پچپن برس کی تھی۔ سترھویں گاگر نکال چکنے کے بعد اس نے اپنے پھڑکتے ہوئے بازوؤں کی طرف دیکھا اور پھر کنکھیوں سے نندو کی بہو گوری کی طرف......

پاٹھ گوداھم کے سب آدمیوں نے گوری کے حسن کی تعریف تو سنی تھی۔ مگر لچھمن کے سوائے اسے جی بھر کر کسی نے نہ دیکھا تھا۔ اس کو دیکھ کر لچھمن کو یاد نہ رہا کہ اس کے ہاتھوں پر ابھی بڑی بڑی مسرت، نیم وا آنکھوں نے کوٹھے سے دھر دیئے ہیں۔ اور وہ عورت جس کے جوڑا گاؤں ننھیال تھے۔ اس کی ماں کو جب لچھمن کے باپ نے سائی کیا تھا تو اچھا خاصا کورو کھشیتر چھڑ گیا تھا

اور اسی لئے تو جب اس نے ایک دفعہ بھابی کا آنچل تھاما تو بھابی نے اس کی ناک توڑ دی تھی .... وقت لچھمن نے اپنے آپ کو ایک بڑی سی ظلمت میں دیکھا جس میں گورے گورے بازو، جھنکارتے ہوئے پازیب، سرکتے دوپٹے اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے یکے بعد دیگرے کئی میل اوجھل سے غلاف آہستہ آہستہ اس کے جسم پر سے اتر گئے ہوں۔ وہ اپنے آپ کو پچیس برس کا نوجوان سمجھنے لگا۔

لچھمن نے سوچا۔ اوّل تو عورتیں بہادری کو پسند کرتی ہیں، کیونکہ ان میں اس مادہ کا نقصان ہوتا ہے اور دوسرے وہ اس مرد کی طرف مائل ہوتی ہیں جو عورت کے سامنے مرد کی فطری کمزوری کو ظاہر نہ ہونے دے۔ دوسرے لفظوں میں بہت سی بس کر بھی اظہارِ عشق نہ ہو۔ کیونکہ دوسری طرح بات کچھ عام سی ہو جاتی ہے۔ آج کتنی چھوٹی بڑی اس کی بہادری کا سکہ مان گئیں۔ آج تو وہ بالکل شیرِ ببر ہو گیا تھا۔ تبھی تو سب رادھائیں اس کی طرف کھچی چلی آتی تھیں۔ مگر اس نے کمزور کم ظرف آدمی کی طرح ان کی طرف ضرورت سے زیادہ متوجہ ہو کر اپنے مردانہ وقار کو کم نہیں کیا اور .... متروکا گمان ہی؟ سرسنگھی کی جان نکل جاتے۔ گوری تو ضرور گھٹی گھٹی یہی سوچتی ہو گی کہ میرا شوہر لچھمن کے مقابلہ میں کس قدر نالائق اور کمزور ہے ..... کاش! میں لچھمن کی بیوی ہوتی۔ اگرچہ آج ان عورتوں میں سے ایک خود بخود بہن اور دوسری بھاوج بن گئی ہے۔ اس وقت لچھمن پل بھر کے لئے بھی یہ نہ سوچ سکا کہ گزشتہ کس طرح بپا ہوا تھا اور اس کی ناک کیوں توڑ دی گئی تھی۔ لچھمن نے نہ جانا کہ وہ کھلی سی آوازیں صرف گاگر بن نکالنے کی قیمت ہیں۔ اگر گھونگھٹ کو ذرا سا جیٹھا کی طرف سرکا دینے سے شرادھ کے لئے سارا پانی مل جاتا ہے تو کسی کا بگڑتا ہی کیا ہے۔ عورتیں اپنی آنکھوں کی ہیرا پھیری سے سینکڑوں کام سدھ کر لیتی ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ سترہ گا گریں تو اکیلی گوری کے حسن کی جھلک کی قیمت ہے اور محض لٹو سی قیمت...... اور وہ مست آنکھیں !...... وگرنہ کون بجا بی ہے اور کون ویلو۔ یہ گوری بھی ایک مایا ہے اور مایا ہی رہے گی!

کاٹھ گودام کے سبھی لوگ جانتے تھے کہ چھمن کو بابا کے نام سے پکارنا کتنا خطرناک کام ہے چھمن بری سے بری گالی برداشت کرنے کی قوت رکھتا تھا۔ مگر بابا کا لفظ اس کے دماغی توازن کو مختل کر دیتا۔ بابا کے جواب میں تو بابا، تیری ماں بابا، تیرا بابا بابا اور اس قسم کی بے تکی باتیں بکتا اور بڑے بڑے پتھر پھینکتا۔ وہ ابھی اپنے آپ کو چھوکرا کیوں سمجھتا تھا؟ اسے کھٹکا سا لگا ہوا تھا کہ اگر وہ بوڑھا ہو گیا تو کون اسے اپنی لڑکی کا رشتہ دینے چلے گا؟ چھوٹے چھوٹے لڑکے بابا چھمن...... بابا چھمن کہہ کر تاتا دیتے۔ مگر وہ اپنے تجربہ کی خوفناک نوعیت سے واقف تھے۔ زور سے بابا کہہ چکنے کے بعد وہ کاٹھ گودام منڈی کی بوریوں کے پیچھے یا اس کی تنگ گلیوں میں غائب ہو جاتے۔

جب کوئی کہتا کہ مالک رام کے بیاہ کی تاریخ ۱۵ ر پھاگن مقرر ہوئی ہے تو چھمن ایک اضطراب کے عالم میں سن باٹی چھوڑ دیتا۔ اپنی لاٹھی کو اٹھا کر زور سے زمین پر ٹیکتا اور کہتا:

"ہاں بھائی!...... ۱۵ ر پھاگن!"

دوسرا کہتا "ہاں بھائی...... ہم نہ بیاہے تو کیسے سات بیاہ ؟"

لیکن لوگ اسے خوش کرنا بھی جانتے تھے کوئی کہتا چھمن! آج تو تیرے چہرے پر سولہ برس کے نوجوان کا روپ ہے۔ ارے بھائی! بڑھیا کی چھوکری جوان ہو رہی ہے ایسی بچی

جوان ہے جیسے تم ہو۔ خوب میل ہے بڑا جوڑ ہے۔ اگر تم اسے حاصل کر سکو تو کتنا مزا رہے۔

لچھمن جوانی میں جنس بے جا اور اغوا کی سزائیں کاٹ چکا تھا۔ اس لئے وہ خاموشی سے دو تین بار۔ بڑھیا کی بیٹی کا نام لیتا اور ذہن میں سینکڑوں بار ـــــ اُٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے ـــــ بڑھیا کی بیٹی ...... بڑھیا کی بیٹی ...... دہرائے جاتا۔ حتیٰ کہ اس کی داڑھی میں کھجلی ہونے لگتی۔

کاٹھ گودام ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ آٹھ نو سو کے لگ بھگ گھر ہوں گے۔ تحصیل سے ایک کچا راستہ کیکر اور شیشم کے تناور درختوں کے درمیان سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا چند میل جا کر ایک بڑے سے بڑ کے نیچے یک دم رک جاتا۔ عام طور پر مسافر وہاں پہنچ کر ششدر رہ جاتے۔ انہیں یونہی دکھائی دیتا گویا راستہ اس سے آگے کہیں نہیں جائے گا۔ یعنی باوجود زمین کے گول ہونے کے کاٹھ گودام دنیا کا ٹرمینس ہے۔ بات دراصل یہ تھی کہ بڑ کی بڑی بڑی داڑھیوں میں سے ہو کر تین چھوٹی چھوٹی گلیاں گاؤں میں داخل ہو جاتی تھیں۔ چند خستہ حالت کے کچے مکانوں، ایک آدھ چھتی اینٹ کی عمارت جس میں بورڈ کا ایک پرائمری اسکول تھا، شاہ رحیم کی قبر اور کالا بھیرو کے مندر کے گرد گھوم کر تینوں گلیاں پھر گاؤں کے مشرق کی طرف ایک کشادہ سی سڑک سے مل جاتی تھیں۔ کالا بھیرو کے مندر کے قریب کالے کالے کتے گھومتے رہتے تھے۔ اور ان کی آنکھوں سے غصہ اور دانتوں سے زہریلا لعاب ٹپکتا تھا۔ کالا بھیرو شو جی مہاراج کے اوتار گنے جاتے ہیں۔ ان کی رفاقت میں ہمیشہ ایک سیاہ فام کتا رہا کرتا تھا۔ اس لئے کالا بھیرو مندر کے پجاری چپڑی ہوئی روٹیوں اور پوریوں وغیرہ سے سیاہ فام کتوں کی خوب تواضع کیا کرتے تھے۔ اس قسم کے کتے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور سرکاری آدمیوں کو انہیں گولی

ڈالنے کی مجال نہ تھی۔ کتے مفت کی کھاتے تھے اور موٹے ہوتے جا رہے تھے۔ کالاڈ گودام میں داخل ہونے والے راستے کے پاس پڑے تھے۔ ایک تنے کے نیچے لچھمن بیٹھا کرتا تھا۔ وہ تین کام کرتا تھا۔ اول تو ہر ناواقف مسافر کو کالا بھیرو والے راستے سے گزرنے کی ہدایت کر کے کتوں سے بچاتا۔ دوسرے اسے اپنے کنوئیں کا ٹھنڈا اور صاف پانی پلاتا اور تیسرے زندگی کا گزارہ کرنے کے لئے سن کی رسیاں بانٹتا۔

کبھی کبھی کوئی انجان مسافر رک کے لچھمن کو چہرے سے درویش صورت پا کر نہایت تپاک سے پوچھتا۔ "پانی پلاؤ گے بابا؟" تو لچھمن فوراً لاٹھی اٹھا لیتا اور کہتا "بیٹی کا رشتہ تو نہیں مانگا جو مجھے بابا سمجھتے ہو۔ اسی کنوئیں سے اس دن سترہ گاگریں پانی کی کھینچی تھیں۔ تمہارے گاؤں کی سب عورتوں کو اپنے دام میں گرفتار کر سکتا ہوں۔ سمجھتے کیا ہو۔ اس بات کو دشنو عطار جانتا ہے.... سارا محلہ جانتا ہے، گاؤں جانتا ہے......"
اور کالا بھیرو کے نام کتے مسافر پہ چھوڑ دیتا۔ اس بیچارے کی خوب ہی آؤ بھگت ہوتی۔ حتیٰ کہ دشنو عطار یا بازار کا کوئی اور دکاندار مسافر کو اس کی غلطی سے آگاہ کر دیتا۔ اور اگر وہ اپنے گاؤں سے اس کے لئے کسی سکھو، جنک دلاری یا رودھیا کا رشتہ لا دینے کا خیال ظاہر کرتا تو اس کی مٹھی چاپی ہوتی۔ بستر بچھا بچھایا استراحت کے لئے مل جاتا اور لچھمن پوچھتا:

"حقہ جلاؤں چاچا...... کالا بھیرو کا گاتھا تو دور دور مشہور ہے۔ سبھی لوگ جانتے ہیں۔ تم نہیں جانتے کیا؟"

کبھی کبھی دشنو اور کالاڈ گودام کی چھوٹی سی منڈی کے لوگ دور سے کسی مسافر کو آتا دیکھتے تو وہ کہتے "لچھمن بھائی، دیکھو وہ کوئی تمہیں دیکھنے کے لئے آ رہا ہے۔ شاید سیتا مہری کا باپ ہے۔ سیتا مہری چوڑا گاؤں کے نمبردار کی لڑکی ہے۔ بہت خوبصورت، ذرا

سنور جاؤ۔ ہاں! بول، پچھمن پہلے تو گانجا کا کش لگاتے ہوئے کہتا ——— او بھائی۔۔۔
پچھمن تو چتی ہے۔ جتی ہونا کتنی اونچی اوستھا ہے۔۔۔۔ مگر پھر فوراً ہی پچھمن اپنی دھوتی اور پٹکے کے بل درست کرنے لگ جاتا اور عطار کی دوکان پہ دھو کر ٹنگی ہوئی قمیص پہن کر جلدی جلدی اس کے بٹن بند کر لیتا اور پھر باوجود نہایت ہوشیاری سے کام لینے کے اس کی داڑھی میں کھجلی ہونے لگتی۔

وشنو عطار کی وساطت سے پچھمن کو کالا تیل مل گیا تھا۔ کم از کم پچھمن کو اس دوائی کا نام کالا تیل ہی بتایا گیا تھا۔ اس میں خوبی یہ تھی کہ برف کی طرح سپید داڑھی چند ہی ملتوں میں اتر سے آنے والی گھٹا کی طرح کالی ہو جاتی تھی۔ پچھمن تو عطار کی حکمت کا سکہ مان گیا تھا۔ یہ وشنو ہی میں طاقت ہے کہ وہ پلک جھپکنے میں پچپن برس کے بڈھے کو بیس برس کا جوان بنا دے۔ پچھمن نے اس کے عوض کتنی ہی سن کی رسیاں بانٹ کر وشنو کو سامان وغیرہ باندھنے کے لیے دی تھیں۔

وشنو کی دوکان پہ کبھی گلقند کے لئے کھانڈ کا قوام پکایا جاتا اور کبھی عرق گاؤ زبان نکالا جاتا۔ ہر روز بھٹی جلتی تھی۔ کبھی کبھی بہت سے اپلوں کی آنچ میں کشتے مارے جاتے تھے اور کالے تیل کا غلام بنا ہوا پچھمن وشنو کے سینکڑوں کاموں کے علاوہ بھٹی میں آگ بھی جھونکا کرتا تھا۔ پچھمن تھوڑا بہت پڑھنا جانتا تھا۔ وہ کبھی کبھی حیرت سے وشنو کی دوکان میں رکھے ہوئے ڈبوں پر جلی قلم سے لکھے ہوئے لفظوں کو پڑھتا۔ عقرقرحا، معجون مرجان، خمیرہ ابریشم عناب والا، جوارش آملہ عنبری۔۔۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی ڈبے تھیں۔ کسی میں عرق برنجاسف تھا اور کسی میں بادیان۔ ایک طرف چھوٹی چھوٹی شیشیاں پڑی تھیں جن میں کشتہ

سنگ یشب شنگرف وغیرہ رکھے تھے۔ ان چھوٹی شیشیوں پر چھمن کی نظریں جمی رہتی تھیں۔

چھٹے شرادھ کے دن چھمن کو نندو کے ہاں پھر بلایا گیا۔ چھمن نے کالا تیل ملا اور نندو کے ہاں جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں گوری کی تصویر بجلی کی طرح کوند کوند جاتی تھی۔ اگرچہ اس کے ہاتھوں پر ابھی تک آبلے دہکتے ہوئے کوئلوں کی طرح پڑے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ مگر گوری کی موہنی مورت اس کے کلیجہ میں ٹھنڈک پیدا کر رہی تھی۔

چھمن نے ریشمی پٹکا باندھا۔ جو اسے کالا بھیرو کے ایک پروہت نے دیا تھا۔ پروہت جی کے جسم پر آبلے پھوٹ جانے پر چھمن نے ان کی بڑی سیوا کی تھی۔ جیٹھ، ہاڑ اور ساون تین مہینے سردائی، ٹھنڈائی وغیرہ رگڑ کر پلائی تھی۔ پروہت کو وہ پٹکا ان کی کسی معتقد عورت نے دیا تھا۔ پروہت کے ارد گرد عورتوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ اور عورتیں انہیں تھالیوں میں سیدھا اور نہ جانے کیا کیا بھینٹ کرتیں۔ عقیدت ہی تو ہے۔

چھمن نے پٹکا باندھا اور بڑے غرور سے وشنو کی دوکان کے شیشے میں اپنی پگڑی کو دیکھا۔ الماری میں لگے ہوئے شیشوں میں اسے اپنی شکل اور چند ایک گدھے دکھائی دیئے۔ گدھے اس کی پیٹھ کی جانب کمہار کے برتنوں سے لدے جا رہے تھے۔ کاٹھ گودام کے نام برتن پک کر تحصیل میں بکتے تھے۔ اور وہ گدھے تحصیل ہی کو جا رہے تھے۔ عطار کی الماری کے شیشے میں چھمن کو اپنا عکس بہت ہی دھندلا سا نظر آتا تھا۔ مگر اس کے باوجود چھمن جانتا تھا کہ یہ اس کا اپنا عکس ہے اور وہ قریب گزرتے ہوئے گدھے کا ..... وشنو نے چھمن کی تیاری کر لینے کی قوت کی جی کھول کر داد دی۔

چھمن نے گوری کے گھر جانے کے لئے قدم اٹھایا تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سارے جسم پر کوئلے ہی کوئلے دھر دیئے گئے ہوں۔ کچھ دیر

کے لیے ہاتھ کی جلن تو ختم ہوگئی۔ کیونکہ اس کا سارا جسم ہی ایک بڑا سا ہاتھ بن گیا تھا۔ بھیمن اٹھا لڑکھڑایا، لیٹ گیا۔ چند لمحات کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے کنوئیں کی منڈیر پر سترہ گاگریں ایک قطار میں رکھی ہوں۔ اس نے آنکھوں کو ملا۔ وہ دکان کے اندر لگے ہوئے جالوں، بھڑ کے دو تین چھتوں اور ایک آرام سے لٹکتی ہوئی چمگادڑ کو دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر کے ہولے سے ایک چھوٹی سی گالی دی۔ کیونکہ وہ اس کے پنکھے سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔

گدھوں پر مزید بوجھ لادا جا رہا تھا۔ کمہار نے چھ ماہ کے عرصہ میں چار پانچ سو برتن حقے کی چلمیں، راہٹوں کی ٹنڈیں بنا رکھی تھیں۔ پہیہ اور پاؤں دن رات چلتے رہتے تھے اور کمہار کے جھونپڑے سے گنگنانے، کھنکارنے، تھوکنے، حقے کی گڑگڑاہٹ اور پٹ پٹ کی آوازیں پیہم سنائی دیتی تھیں۔ گدھے تو بوجھ محسوس ہی نہیں کرتے تھے۔ گویا سارے کا سارا کاٹھ گودام اٹھا لیں گے۔ بھیمن نے دل میں کہا۔ یقیناً یہ گدھے مجھ سے زیادہ بوجھ اٹھا سکتے ہیں ...... اگرچہ سترہ گاگریں......

اس وقت کمہار نے آواز دی "او گدھے کے بچے!"

بھیمن نے کہا۔ آخر وہ گدھے ہیں اور میں آدمی ہوں۔ اگر یہ بات اونچے کہی جاتی تو شاید وہ شنو ایک دفعہ پھر اس کی امتیاز کرنے والی غیر معمولی قوت کی داد دیتا۔ ــــــ بازار میں ایک لڑکا جسے کھانسی کی شکایت تھی، بڑے مزے سے کھٹرا کچوٹے کھا رہا تھا اور کھانسے جاتا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک نسبتاً چھوٹا لڑکا قمیص کا کف منہ میں ڈال کر چوس رہا تھا۔ کئی بچے کریسے تحصیل سے منگوائی ہوئی برف کے گولوں پر لال لال شربت ڈلوا کر انہیں چاٹ رہے تھے۔ گلی میں چند عورتیں باتیں کر رہی تھیں۔ ایک کہتی تھی جب میرا چندو پیدا ہوا تو اسی

دھنی ہواری کاٹ نے پچھاڑ دیا۔ ادھر شنو پکوڑے والے سے پوچھ رہا تھا "کیوں بھائی اس دفعہ ادھر کبھی پر نہ جاؤ گے؟" چھوکروں نے لچھمن کو دیکھا تو اس کا حلیہ عجیب ہی بنا ہوا تھا۔ ان کا بابا لچھمن کاگ کی طرح تیر کر سطح پر آ گیا۔ لڑکے چلانے لگے "بابا لچھمن...... بابا لچھمن!"

لچھمن بوکھلا کر اٹھا۔ چھت پر چکا دو چکر لگانے لگے۔ دو تین بھیڑیں جھنجھنانے لگیں۔ چارپائی کے پائے سے لچھمن کا گھٹنا ٹکرایا۔ اسے ایک بڑا سا چکر آیا۔ لچھمن نے ہوا کو گالی دی، چھینکا اور رونے لگا۔

گوری عرصہ تک سنئے لچھمن کو دیکھ کر ہنستی رہی۔ اب اسے ایسے دکھائی دے رہا تھا، جیسے وہ لچھمن کے عجیب سے روپ کو دیکھ کر شرادھ تو کیا اپنے پتر دل تک کو بھول گئی ہے۔ پھر داستان کے پروہت بھی آ گئے ہوئے تھے۔ جب گوری ان کی تواضع کرتی تو لچھمن کے دل میں خلش سی محسوس ہوتی۔ پھر وہ اپنی کم ظرفی پر اپنے آپ ہی کو کوستا۔ جب پروہت چلا گیا تو گوری نے گھونگھٹ چہرے کی طرف سرکا دیا۔ عورتیں پچھلی بجوڑوں اور نوجوانوں سے پردہ اٹھا رہی ہیں اور اس نے لچھمن سے پردہ اٹھا دیا تھا۔ لچھمن نے مشکوک نگاہوں سے گوری کو دیکھا۔ دل میں یہ فیصلہ کیا کہ محبت بھی تو کسی کو بے پردہ بنا دیتی ہے۔ گوری نزدیک آئی تو لچھمن نے یوں محسوس کیا جیسے اس کے وجود کا اسے قطعی علم نہیں۔ اور جوں جوں وہ بے اعتنائی ظاہر کرتا گوری کھنچی چلی آتی تھی۔ لیکن پھر سوچا کہ یہ سب پچھلے کھچاؤ کی تبدیلی کی وجہ سے تھا۔

...ڈی سے فارغ ہونے پر محلہ بھر کی عورتیں لچھمن کے گرد ہو گئیں۔ گوری ہی سب کی ترجمانی کر رہی تھی۔ "بیوی! اشنان کرو گی؟ بہن جی! تو مان گئی لچھمن کو...... اپنے مرد تو بالکل ہی کام

سکے نہیں۔ وہ گا ؤں ان کے گھر سے کنویں سے نہ نکال سکیں۔ بھیکن راٹھور سچ آدمی نکلتے ہے...... ان کے ڈھول سنے ہماری تمہاری لاج رکھ لی تھی۔ اب کل کی ہی تو بات ہے۔ کتنے آن ہوا سے تھے راٹھور!"

بھیکن کا منہ کانوں تک سُرخ ہو گیا۔ اس نے اپنی خوشی کو چھپانے کی کوشش کی۔ مگر ناکامیاب رہا۔ وہ عورت جس کے جوڑا گاؤں ننہال تھے اور جس سے گاگر کی بہن کا رشتہ تھا۔ بولی "میں تو بھابی کے آنے پر خوب رنگ رلیاں مناؤں گی۔ ناچوں گی...... گاؤں گی...... سگری رین موہے سنگ جاگا۔ بھور بھئی تو بچھڑن لاگا...... اور بھابی کتنی خوش ہو گی!"

گاگر کی بھابی بولی: "میں نے تو اپنے لئے دیورانی ڈھونڈ بھی لی ہے۔" بھیکن کے کان کھڑے ہو گئے جب بھابی نے کہا۔ مجھے تو اس کا نام بھی معلوم ہے، تو بھیکن بہت خوش ہوا۔ ضبط نہ کر سکا۔ بولا:

"کیا نام ہے بھلا اس کا؟"

"نام بڑا سندر ہے۔"

"کہو گی بھی؟"

"ذرا مزاج کی سخت ہے۔"

"میں جو نرم ہوں۔"

"گوری بھی جانتی ہے۔"

"کوئی کہے گی بھی؟"

"کاہو دیوی! گوری نے کہا۔

"کاڈ دیوی؟" لچھمن نے پوچھا۔ دو دفعہ نام کو دہرایا اور ذہن میں سینکڑوں بار اس کا جاپ کیا۔ حتیٰ کہ اس کی داڑھی میں کھجلی ہونے لگی۔

گوری بولی: "تم اعتبار نہیں کرتے تو میں کالا بھیرو کی سوگند لیتی ہوں۔ کاڈ دیوی سے بیاہ کروانے کا میرا ذمہ۔ سارا خرچ بھی اپنی گرہ سے دوں گی۔"

اب لچھمن کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ وہ شب و روز نندو کے گھر کا طواف کرنے لگا۔ اس کے ذرا سے اشارے پر تحصیل چلا جاتا۔ کمہاروں کے گدھوں سے زیادہ بوجھ اُٹھا لیتا۔ کالا بھیرو کے کتوں سے زیادہ شور مچاتا اور کالکا گودام کے سانڈوں سے زیادہ کھاتا۔

اس دفعہ برسات میں گوری کے گھر کا پرنالہ اوپر کی منزل پر بند ہو گیا تھا۔ گوری نے لچھمن کو کہا کہ وہ چھجے پر چڑھ کر پرنالہ صاف کر دے۔ لچھمن نے کوٹھے پر چڑھ کر دیکھا تو پرنالے میں ایک کتے کا پلّہ مرا پڑا تھا اور پلے کا سر پرنالے میں بے طور پھنس گیا تھا۔ اب پلّہ کالے رنگ کا تھا۔ اس کی عزت ملحوظ خاطر تھی۔ مار کاٹ کر باہر نکالنا کالا بھیرو کی بے عزتی کرنا تھا۔ مگر پلّہ نہ اوپر آتا تھا نہ نیچے جاتا تھا۔

لچھمن اپنے آپ میں ایک نئی جوانی پا رہا تھا۔ اور عنقریب ہی شادی کی خوشی میں اس نے جوان بننے کے لیے رشو عطار کی کئی دوائیاں کھائیں۔ آج دوائی زیادہ کھا لینے کی وجہ سے اس کا سر پھٹ رہا تھا۔ اور اسے تمام جسم میں سے شعلے نکلتے دکھائی دیتے تھے۔ جوش میں وہ سب کام کئے جاتا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے تک وہ سخت دھوپ میں چھجے پر بیٹھا پرنالے کو صاف کرتا رہا۔ نیچے سے چند بچوں اور عورتوں نے آوازیں دیں۔

"بابا...... بابا...... کاؤ دیوی آئی"

لچھمن نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ بچوں کو گالیاں دیں، کتے کے پلے کو دم سے پکڑ کر زور سے کھینچا تو وہ جھٹکے سے باہر نکل آیا۔ مگر ساتھ ہی لچھمن کو اس زور سے جھٹکا لگا کہ وہ اوپر کی منزل سے زمین پر آ رہا۔

سارے کا سارا کاٹھ گودام نند کے گھر چل پڑا۔ لوگوں کو لچھمن کے یوں مجروح ہونے کا بہت افسوس تھا خصوصاً جبکہ کاؤ دیوی سے اس کی شادی کا چرچا چھوٹے بڑے کی زبان پر تھا۔ نرم دل لوگوں نے بے چارے کی مصیبت پر آنسو بھی بہائے۔

شام کے قریب خبر ملی کہ چوٹ ووٹ کی اب کوئی بات نہیں رہی۔ لچھمن شادی کے لئے بالکل تیار ہے۔ آج شام کو اس کی شادی ہوگی۔ گاگر کی بھابی تو کہتی تھی "اتنی بھی جلدی کاہے کی ہے...... لچھمن کوئی بوڑھا تھوڑے ہی ہو گیا ہے؟"

شام کو باجا بجنے لگا۔ کاٹھ گودام کے بہت سے آدمی براتی بن کر شادی میں شامل ہوئے۔ لچھمن کو بہت اچھے پہناوے پہنائے گئے۔ سہرے باندھے گئے۔ وہ اور بھی جوان ہو گیا تھا۔ لوگوں نے شمشان میں ایک بڑے پرانے پیپل کے پیڑ تلے نوجوان لچھمن کو رکھ دیا۔ ایک طرف سے آواز آئی "ہٹ جاؤ...... دلہن آ رہی ہے"...... ایک آدمی چھکڑا گھسیٹتا ہوا لایا۔ چھکڑے میں سے لکڑیاں اتار کر زمین پر چتا کی صورت میں چن دی گئیں۔ اوپر لچھمن کو رکھا اور آگ جلا دی...... یہ عجب شادی تھی جس میں سب براتی رو رہے تھے، اور جب نند کی بھوگری نے کاؤ کی ان تمام لکڑیوں کا خرچ اپنی گرہ سے دیا تو اس کی چیخ ہی نکل گئی۔

ردِ عمل

جلال کو بالآخر فرصت مل ہی گئی کہ وہ اپنی عیش و نشاط کی محفل کو چھوڑ اور دختِ رز سے رخصت لے کر اپنے مرتے ہوئے چچا کو اس کی درخواست پر ایک دفعہ دیکھ لے۔

ابھی ابھی تھوڑا سا مینہ برسا۔ حبیب منزل کے سامنے پانی نشیب میں کھڑا ہو گیا۔ صرف گزرنے کے لئے ایک چھوٹی سی مخدوش پگڈنڈی رہ گئی۔ جلال نے اپنی پتلون کے پائنچوں کو احتیاط سے سنبھالتے، ایڑیاں اٹھا اٹھا کر قدم رکھتے اور خاموشی کی زبان میں اس اہم طلب کی وقعت کو غیر ضروری گردانتے ہوئے اپنے چچا کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

سکینہ، جلال کی چچا زاد بہن نے دروازہ کھولا اور پھیلتی ہوئی آنکھوں سے جلال کی طرف دیکھا۔ اور آنسو کا وہ قطرہ جو کہ پہلے آنکھ میں اٹکا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ٹپک پڑا۔ کچھ حیرانی سے اس نے کہا:

"جلال! تم آ گئے... ابا جان کی امیدوں کے خلاف ــــ وہ تمہیں ابھی ابھی یاد کر رہے تھے۔"

جلال نے بہن کی بات کو بے دلی سے سنا۔ برآمدے کے اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے نیم بوسیدہ ٹاٹ سے اپنے بوٹوں کو نہایت اطمینان سے رگڑ رگڑ کر کیچڑ سے پاک کیا۔ ایک عام دنیا دار کی مانند جلال نے ظاہری اضطراب کا کوئی نشان چہرے پر پیدا نہ ہونے دیا۔ نہ اس کی آنکھیں اپنے حلقوں میں گھبراہٹ سے پھیلیں۔ نہ اس کی رفتار میں خلافِ معمول سرعت آئی۔ چیسٹر کو اتار کر کندھے پر ڈالتے ہوئے وہ برآمدے کے دائیں کونے کے دریچے میں جو گلی میں کھلتا تھا۔ کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے ختم ہوتے ہوئے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا اور اسے گلی میں پھینک دیا۔ سکینہ جو اپنی والدہ کو جلال کی آمد کی اطلاع دے کر آئی تھی، بولی:

"جلال ــــ تم ابھی یہیں ہو بھائی؟"

"چچا کس کمرے میں ہیں، یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں سکینہ؟"

"اس کمرے میں...... جس کے سامنے تم کھڑے ہو، جلال! جلدی پہنچو۔ تمہارے پہنچنے سے شاید ان کی مضمحل طبیعت کچھ بہل جائے۔"

جلال نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر ڈاکٹر پر پڑی۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں ایک پرانی سی سٹیتھوسکوپ تھی، دوسرے ہاتھ کی انگلی کو لبوں تک لے جاتے ہوئے اس نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ جلال ایڑیوں کے بل چلتا ہوا کمرے کے داہنی طرف ہو لیا۔ وہاں سے اسے اپنے چچا حبیب احمد ادیب کا زرد چہرہ صاف طور پر نظر آ رہا تھا اس پر تھکاوٹ کے آثار اچھی طرح سے نمایاں تھے۔ اس کا ہر ایک خط جو کسی نتیجہ خیز تجربۂ زندگی

کی نشانی تھا۔ زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ نقاہت کی وجہ سے ان کی آنکھیں مکمل طور پر بند نہ تھیں۔ اور بے رونق نیم وا آنکھوں کے دھندلے پن کو دیکھ کر دل کو ایک وحشت سی محسوس ہوتی تھی۔

"یہ ہے زرد رو جھریوں والا کل انچاس برس کا منحنی بوڑھا جس کی بابت ملک الشعرا نے کہا تھا کہ وہ مکمل آدمی ہے۔" جلال نے دل میں کہا۔ "کتنا بڑا خطاب دیا اس نے۔ مکمل آدمی ہونا کتنا بڑا امتیاز ہے۔ آج کون آدمی صحیح طور پر مکمل کہا جا سکتا ہے۔"

معاً ادیب نے آنکھیں کھولیں اور اپنا منہ دائیں طرف موڑا۔ سامنے جلال کھڑا تھا اس نے سلام کیا۔ لیکن ادیب نے صبر و سکون اور بے چینی کے مابین کشمکش کو محسوس کرتے ہوئے ماتھے پر تیوری چڑھا کر آنکھیں بند کر لیں ...... ان کے لب آہستہ آہستہ پھڑک رہے تھے۔ گویا ایک صدیوں سے آشنا، پرحلاوت، جذبات سے لبریز ایک قسم کے ہسٹریکل (HYSTERICAL) بوسے کے لئے مرتعش ہوں ..... اور جیسے ان کی روح عریاں ہو کر قلب کی اندرون ترین ماہیتوں میں ایک ایسے ہلکے ہلکے میٹھے، مدہوش کن صورت ازل اور ایک ایسی خنک سی تجلی کی متلاشی ہو جو اس مقام ہُو کی عمیق، بیکراں تاریکیوں میں اس کے لئے شمع بردار ہو جائے اور اس کی رہنمائی کی وجہ سے وصل تمام ممکن ......

جلال نے اپنے بائیں طرف ادیب کی تصنیف کردہ کتابوں پر ایک چلتی ہوئی نظر ڈالی۔ الماری کے پاس ہی اخروٹ کی لکڑی کا ایک ہشت پہلو میز دھرا تھا۔ اس میں کہیں کہیں سپید گلکاری کی ہوئی تھی۔ میز کے اوپر قلم دوات، چائے کی ایک پیالی اور ایک دہرا کیا ہوا کاغذ پڑا تھا۔ جلال نے کاغذ کو ہاتھ میں لے لیا۔ لکھا تھا:

بوڑھے کے آنسو چار سو بکھرے پڑے تھے
اس نے ساری عمر کوئی ڈھنگ کا کام نہ کیا تھا۔
بوڑھے نے سر اٹھایا اور کہا ـــــ
زندگی کے اسباب بکھرے پڑے ہیں،
سچی معشوق کی مسکراہٹوں کی مانند،
کسی غریب کے دل کی جمعیت کی مانند،
صرف ایک سبق رہ گیا ہے ـــــ پشیمانی کا،
ـــــ آموت! وہ بھی سکھا دے،

"حبیب"

جلال کی طبیعت پریشان سی ہو گئی۔ وہ بے پڑھا ضرور تھا۔ مگر ایک لطیف ذہن اور ایک حساس دل کا مالک تھا۔ اس کے مزاج کی مستقل دیوار متزلزل ہو گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کچھ نیلے، سرخ، مبہم سے حلقے ایک دوسرے میں خلط ملط ہو کر اس کی آنکھوں کے پاس کن پٹی سے چھو کر انواع و اقسام کی اقلیدسی اشکال پیدا کرتے ہوئے فضا میں دور نزدیک پھیل رہے ہیں۔ اس کے ذہن میں آہستہ آہستہ ایک خلجان سا پیدا ہوا۔ ایک غنودگی یا نیم غشی کی سی حالت میں اس کے قلب میں یک لخت ایک تحریک، ایک زبردست سی رو پیدا ہوئی اور اس نے چاہا کہ وہ اپنے سامنے میز پر پڑی ہوئی پیالی کو اوندھا کر دے۔ یہ بے ربط لاحاصل خواہش کیونکر پیدا ہوئی۔ جلال نہ جان سکا۔ وہ صرف اس بات سے واقف تھا کہ ایک اندرونی طاقت اسے ایسا کرنے پہ مجبور کر رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے دل کے ساتھ تصفیہ کر لیا کہ وہ ہرگز ہرگز پیالی کو اوندھا کرنے کے فضول خیال کو عملی جامہ نہیں پہنائے گا۔

بلکہ اس قسم کے خیال پیدا ہونے پر اس نے اپنی کمزور طبیعت کو کوسا لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس نے دیکھا کہ جب تک وہ پیالی کو اوندھا نہ کرے گا۔ اس کے لئے زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا ــــ مشکل، ناممکن...... اور سب کے دیکھتے ہوئے اس نے پیالی کو اوندھا کر دیا۔ تھوڑی سی چائے میز پر سے بہتی ہوئی فرش پر گر گئی۔ سب حیرت سے جلال کی طرف دیکھنے لگے...... اس کے فوراً بعد ہی اسی قسم کا خیال پیدا ہوا کہ وہ رو دے۔ اس وقت جلال نے اپنی ذہنی تحریک کے خلاف جانا بالکل بے سود سمجھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب نہ رونا اس کے بس کا روگ نہیں۔ اس وقت اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر اندرونی حکم کے تابع کر دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا......

محفلِ عیش و انبساط سے نکل کر اس فوری درد و کرب کی فضا میں جہاں قہقہوں کی بجائے آنسو، جوانی کی بجائے بڑھاپا، ناکردہ گناہوں کی پشیمانی، موت گھوم رہے ہوں، اس کا جی نہ لگا۔ جلال نے ایک عجب انداز سے شانے پھڑکائے۔ دیئے جلاتے ہوئے سگریٹ کی راکھ کو چٹکی سے گرایا اور دل میں کہا کہ کہیں سگریٹ کو باہر پھینک دینے کا خیال اس کے ذہن میں نہ پیدا ہو جائے۔ وہ کانپ اٹھا۔ برقی رو آنے سے پیشتر جلال ایڑیوں کے بل چلتا ہوا کھڑکی میں پہنچا اور سگریٹ کو باہر پھینک دیا۔ دور...... بہت دور، جتنی دور اس سے ممکن تھا۔ اور روکھی سی مسکراہٹ لبوں تک لاتے ہوئے سوچنے لگا۔ بھلا ایک مکمل آدمی، محض ایک معمولی سی پشیمانی کی خاطر موت کو دعوت دیتا ہے۔ ناگاہ اسے یاد آیا کہ اسی نوعیت کا ایک اور خیال بھی چچا نے اپنی کتاب "رنگ و آہنگ" میں ظاہر کیا تھا کہ انسان اس قدر خود سر اور خود بیں ہے کہ اس پر آسمان کی گردش سے جتنی بھی بلائیں نازل ہو سکتی ہیں یکسر نازل ہو جائیں تو بھی انسان خود کردہ فعل کو غلطی یا گناہ کہتے اور صحیح طور پر پشیمان ہونے کی بجائے

پھر باتوں سے دل کی تسلی کے سامان بہم پہنچائے گا۔ وہ ہر وقت بچپن کے گناہوں کو طفلانہ پن، جوانی کے گناہوں کو جوانی نادانی پر اور بڑھاپے کے گناہوں کو انسانی ناتوانی اور کمزوری کے سر تھوپے گا۔ حتیٰ کہ حد سے زیادہ دیر ہو جائے گی اور موت اپنے تلخ جام کے ساتھ اس کے ہر رگ و ریشہ میں پشیمانی کا سبق سرایت کر دے گی۔ ایک عمیق اور تنقیدی نظر اپنی مختصر سی زندگی پر ڈالتے ہوئے جلال نے کہا: کس قدر درست بات ہے —— برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن...... قیامت کب کسی نے دیکھی ہے...... یہی دن تو ہیں.... اور ایسے اس قسم کے سینکڑوں کلمات اب تک ایتھر میں لہروں کی صورت گھوم رہے ہوں گے۔

"میں جلال سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" دفعتہً جلال کے چچا نے بہت نحیف آواز سے کہا۔ اور نہایت آرام و سکون سے اپنی آنکھیں اس طرف پھیر لیں۔ جلال تیزی سے چچا کی چارپائی کے نزدیک دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔

"سکینہ —— سامنا دروازہ تو کھول دو —— مجھ تک ہوا آنے دو۔" ادیب نے پھر کہا۔

ایک لمحہ کے لئے چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ سکینہ نے دروازہ کھولا۔ ٹھنڈی ہوا یکدم فراٹے سے اندر داخل ہوئی...... سب نے ادیب کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"باہر بارش اچھی ہو گئی ہے نا؟"

"جی چچا جان!..... کافی برس گیا پانی۔"

اور اپنی دھندلی آنکھوں میں سے باہر دیکھتے ہوئے ادیب بولا:

"دنیا کس قدر وسیع ہے...... رنگین اور بے رنگ بھی۔"

"جی ہاں.... بہت وسیع ہے۔ رنگین اور بے رنگ بھی۔" جلال نے چچا کے تخیل

کی رُو کو سرعت سے بدلتے ہوئے دیکھ کر حیرت سے دہرایا۔ ادیب کے اس طرح باہر دیکھنے پر سب لوگ باہر کی طرف دیکھنے لگے۔ باہر کچھ بھی نہ تھا۔ صرف سخت سردی میں ایک اندھا لاٹھی ٹیکتا ہوا جا رہا تھا۔ جلال نے چچا کی طرف دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ چچا کچھ کہنے کو تھے مگر قوتِ ارادی کی ناتوانی کی وجہ سے کہہ نہ سکے۔ جلال نے دیکھا دوبارہ حد سے زیادہ زور لگاتے ہوئے چچا نے کہا:

"دیکھو جلال بیٹا..... باہر ایک اندھا جا رہا ہے۔ اس کے راستہ پر نشیب و فراز دو تو ہیں جنہیں وہ دیکھ نہیں سکتا۔ تاہم اسے چنداں فکر لازم نہیں۔ اس کے پاس لاٹھی ہے۔"

——— ایسے معلوم ہوا جیسے یہ بات کہنے میں ادیب نے اپنی تمام قوت صرف کر دی ہو۔ ان کو دو ہچکیاں سی آئیں اور اس سے پہلے کہ فضا میں ہاؤ ہو کی آوازیں لرزش پیدا کر دیں ان کا جسم ساکت ہو گیا اور برف کی مانند ٹھنڈا۔

چچا حبیب احمد کو کفنانے دفنانے کے بعد واپس لوٹتے ہوئے جلال ایک اضمحلال سا محسوس کرتا ہوا بازار کی رونق میں سے گزر رہا تھا۔ سینتیس برس کی عمر میں خود کو چچا کے مقابلے پر لاتے ہوئے وہ اپنے آپ کو زیادہ معمر محسوس کرنے لگا۔ اور شاید زیادہ تجربہ کار۔ لیکن اس کے خیال میں تلافیِ مافات کے لیے بہت دیر ہو چکی تھی ——— بہت دیر..... اور وہ مضرات جو کہ انسان کی بہتری کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ اپنی تخریب سے بدن میں کپکپی پیدا کر رہے تھے۔ یکایک اس کے رونگٹے کھڑے ہونے شروع ہو گئے اور اسے کانوں میں سائیں سائیں اور نفس کی نوع بہ نوع موافق اور ناموافق سی آوازوں کے درمیان چچا کے آخری الفاظ گونجتے سنائی دیتے ——— "باہر ایک اندھا جا رہا ہے۔ اس کے راستے پر نشیب و فراز

دونوں ہیں جنہیں وہ دیکھ نہیں سکتا۔ تاہم اسے چنداں فکر نہیں۔ اس کے پاس لاٹھی ہے!"
"کیا یہ الفاظ کسی تشبیہہ مجازی کے حامل تھے یا یونہی ایک گزرتے ہوئے نابینا کو دیکھ کر ایک علیل دماغ کی واہی تباہی ——؟" جلال نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ پھر جلال نے سوچا، چچا استادِ استعارہ مانے جاتے تھے اور یہ کبھی ممکن نہیں کہ اپنے حواس کی موجودگی میں وہ الفاظ انہوں نے بے معنی طور پر اور اتفاقاً کہے ہوں گے...... پھر اس نے اپنی تمام تر علمیت جو کہ اب گزرے ہوئے زمانہ کی ایک حسین یادگار رہ گئی تھی طلب کیا۔ اور دل ہی دل میں ان الفاظ کی تفسیر و تشریح کرنی شروع کی۔

خوانچے والوں کی آوازیں، اخبار بیچنے والوں کا شور و غوغا، سینما والوں کے بانگ دہل اعلان، ریڈیو مکینک کی دکان کے اندر ایمپلی فائر کی مدد سے بلند ہوتا ہوا گانا، خوب صورت نیو ماڈل کاروں کے ہارن، اس کے کانوں میں جگہ پانے سے قاصر رہے۔ اس کے پاس ہی سے ایک مونگیے رنگ کی فراج سیڈان گزری۔ جس کو ایک مونگیے رنگ کی وردی کا شوفر چلا رہا تھا۔ کار کے اندر ایک نازنین اسی رنگ کی ایک کریپ کی نہایت خوش نما ساڑھی پہنے بیٹھی تھی۔ گزرتے ہوئے لوگ رنگ کی اس مشابہت و مطابقت دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرا رہے تھے۔ جلال جو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کار کی آخری سیٹوں کو دیکھا کرتا تھا اس نے صرف ایک نظر سے اس کار میں دیکھا۔ اس کے فوراً بعد ہی اس کی نظر چند بھک منگوں کی طرف چلی گئی اور اس نے محسوس کیا جیسے کوئی کہہ رہا ہو "دنیا کس قدر وسیع ہے، رنگین اور بے رنگ بھی ——" اور جلال زمین پر نظریں گاڑے ہوئے وہاں سے گزر گیا۔

رٹز ریسٹوران کے خانساماں نے اپنے گاہک جلال کو اپنے کیبن کے نزدیک رکتے ہوئے دیکھ کر کہا: "حضور! پیرس سے پنیر کے دو ورقے سموسے آئے ہیں۔ شامپین سے

ان کا حاصل ......"

جلال نے ایک سخت نگاہ سے خانساماں کی طرف دیکھا اور کہا: "پیچھے ہٹ جاؤ ــ نامعقول۔" اور خود آگے بڑھ گیا۔

"چچا آخر کتنا سادہ آدمی تھا۔" جلال نے سوچا اور نفس کش، صحیح معنوں میں کفایت شعار خرچ کرنے کی جگہ خرچ کرنے والا۔ خاموش، سنجیدہ مزاج مگر بولنے کی جگہ جوشیلا مقرر..... حقیقت و اصلاح کے لئے قدرت کی مثبت و منفی دونوں طاقتوں کا استعمال کرنے والا ــ آخر وہ مکمل آدمی تھا۔

ــــ ایک دفعہ پھر اس کے کانوں میں ادیب کے آخری الفاظ گذرے۔ جس طرح تمام روئے زمین پر پھیل چکنے کے بعد ایتھر میں پھر ایک معین وقفہ کے بعد لہر آتی ہے ــ

"باہر ایک اندھا جا رہا ہے۔ اس کے راستہ پر نشیب و فراز دونوں ہیں جنہیں وہ دیکھ نہیں سکتا۔ مگر اسے چنداں فکر لازم نہیں۔ اس کے پاس لاٹھی ہے۔"

تمام پریشانیوں سے اپنی توجہ کو یک سو راغب کرتے ہوئے اب جلال نے مرحوم چچا کے آخری الفاظ کی تفسیر کرنی شروع کی۔ یکایک اس کے گالوں پر ایک ہلکی ہلکی سرخی جو شفق پر سورج کی پہلی کرن نمودار ہونے یا حجلۂ عروسی میں پہلی مرتبہ متقابل جنس کے بازوؤں میں مستغنی ہونے سے دلہن کے چہرے پر ہویدا ہوتی ہے نمودار ہونے لگی اور ایک تلخ سی مسکراہٹ جو دوشیزگی کے وقار کو کھونے کے باوجود پیدا ہوتی ہے۔ مسکراتے ہوئے اس نے کہا:

"آخر کتنا عمیق تھا چچا کا مطالعہ۔ انسان کی زندگی کے غیر ضروری ناقابل توجہ ولمحات سے وہ روزانہ سبق لیتے تھے۔ زندگی کی ہر لطیف جنبش سے انہوں نے کچھ نہ کچھ اخذ کیا حتیٰ کہ موت سے پشیمانی، اس کی تفسیر اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسان اپنے مستقبل یعنی زندگی

کے نشیب وفراز اور اونچ نیچ۔ ستہ پر ایک بے خبری کے عالم میں جا رہا ہے کیونکہ وہ ہونے والے واقعات سے آگاہ نہیں۔ وہ اونچی نیچی جگہ کو دیکھ نہیں سکتا۔ جس طرح اندھا آدمی اپنی لاٹھی کی مدد سے اپنا راستہ نشیب وفراز، پانی اور کیچڑ وغیرہ میں سے نکال لیتا ہے، اس طرح آدمی اپنی دور اندیشی کی لاٹھی سے اپنی زندگی کو بے خطر اور استوار بنا سکتا ہے۔ جس اندھے کے پاس لاٹھی اور جس انسان کے پاس دور اندیشی نہیں وہ دنیا کے نشیب وفراز، پانی اور کیچڑ میں منہ کے بل گرے گا۔

جلال نے کلائی پہ بندھی گھڑی کا آستین ہٹاتے ہوئے وقت دیکھا ساڑھے سات بجے تھے اور سردیوں میں ساڑھے سات بجے اچھا خاصا اندھیرا ہو جاتا ہے۔ دھند نے سورج کے غروب ہوتے ہی تمام شہر کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا...... اور یہ بلیرڈ کلب میں جانے کا وقت تھا۔

بلیرڈ کلب، سموکنگ کلب، پرل کلب یہ سب ایک ہی بات تھی۔ یہ سب مہذب مرد عورتوں کی تفریح گاہیں تھیں۔ جلال نے اپنی جیب ٹٹولی۔ پرسوں کی سویپ اور پرل میں اس نے بہتر روپے جیتے تھے۔ جلال کو وہ کھلبلی سی محسوس ہونے لگی جو ہر ایک جیتے ہوئے کھلاڑی کو اور داؤ لگا کر سب کچھ گنوا دینے کے لئے اکساتی ہے۔ جلال ایک دم رُک گیا۔ چسٹر کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اس نے فیصلہ کن اقرار و دعویٰ سے کہا کہ وہ یقیناً ان روپوں کو کسی بہتر کام میں صرف کرے گا۔ وہ اپنی جیلی بسری بیوی کے لئے گرم ساڑھی لائے گا یا اپنے بڑے بیٹے کے لئے جو ایک مقامی کالج میں ایف اے کا متعلم تھا۔ ایک چھوٹی سی لائبریری خریدے گا۔ وہ نظارہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا، جبکہ اس کے بیٹے نے نہایت اشتیاق سے کتابیں خرید کر لا دینے کی التجا میں انگلستان کے بڑے بڑے پبلشر

انگلیوں پر گِن ڈالتے تھے

آج پھر جلال نے اپنی گذشتہ زندگی پر ایک نظر ڈالی۔ اس نے دیکھا کہ تمام گذشتہ وقت جوانی کا بیش قیمت زمانہ اس نے عیش و نشاط کی محفلوں، مہذب بدمعاشوں کی صحبتوں اور طوطا چشم ایکٹرسوں کو طول و طویل چٹھیاں لکھ کر ان کی تصاویر منگوانے میں گنوایا تھا اور خود کو اس اندھے کی مانند بنا دیا جس کے پاس لاٹھی نہ ہو اور جسے ہر طرح کا فکر لازم ہو اور اب بھی وہ زندگی کے نشیب و فراز میں دور اندیشی کی لاٹھی کے بغیر بھاگا جا رہا تھا اور وہ بھی بے تحاشا!

اس نے بازار میں گذرتے ہوئے تمام آدمیوں کو دیکھ کر انسانی فطرت کے مطابق اپنے دل کو تسلی دینی شروع کی۔

"ان میں سے کسی کے پاس لاٹھی نہیں ہے۔ اگر ان میں کوئی سنبھلا ہوا ہے بھی تو وہ شخص ہے جو کہ لاٹھی کے نہ ہوتے ہوئے بے تحاشا نہیں بھاگتا۔ بلکہ استقلال سے قدم بہ قدم چل رہا ہے۔"

"مجھے کم از کم بے تحاشا نہیں بھاگنا چاہیئے۔" جلال نے دل ہی دل میں خود کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ اس نے دیکھا کہ وہ خوبصورت استعارے کے زیرِ اثر خود بھی سست پڑ گیا ہے۔ اس کی رفتار ایک عام کاروباری آدمی کی رفتار سے بہت کم ہو گئی تھی۔ جلال نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ اور تیز چلتے ہوئے اس نے قدرے اونچی آواز سے کہا:

"اپنی وہ لاٹھی جو میں نے گھر کے ایک کونے میں پھینک رکھی ہے اور جس کی ہستی کو بھی بھول چکا ہوں۔ محنت اور کاوش سے ڈھونڈ نکالوں گا اور اسے استعمال کیا کروں گا۔"

شہر کے قمار خانے کی شکل پگوڈا سے مشابہت رکھتی تھی۔ بنکاک کے ایک اعلیٰ کاریگر نے اسے بنایا تھا۔ اس کے چاروں طرف پینتالیس سیڑھیاں تھیں اور صبح و شام شہر کے لوگ سمندر سے

آنے والی ہوا سے لطف اندوز ہونے کے لئے وہاں جمع ہو جاتے۔ شراب کے متعلق ملک کے اس حصّے کا قانون سخت گیر نہ ہونے کی وجہ سے کئی شخص پینے کے بعد ایک سیڑھی پر بازو رکھ کر اسے تکیے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے باقی کا جسم نچلی سیڑھی پر رکھے پڑے رہتے تھے۔ جس طرح کسی بڑے دریا کے ریتلے کناروں پر گھڑیال دھوپ تاپنے کے لئے پاؤں پھیلا کر دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑے رہتے ہیں۔ جلال حسبِ معمول ان انسان نما گھڑیالوں یا گھڑیال نما انسانوں سے بچتا بچاتا قمار خانے کے اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھی جو دو دن سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ نہایت خلوص سے اسے ملے۔ مگر جلال دردِ سر کا بہانہ کر کے ان سے معذرت کا خواہاں ہوا اور ایک آرام کرسی میں دھنس گیا۔

جلال صبح سے بھوکا تھا اور حالتِ گرسنگی میں آدمی لطیف سے لطیف خیالات تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ جلال جس کا پیٹ طرح طرح کے کھانوں کے علاوہ حرص و ہوا سے نار رہتا تھا۔ آج اس قابل تھا کہ اسے دور کی سوجھ سکے۔ اور وہ گزشتہ زندگی کے چیدہ چیدہ کے واقعات کا تصور کر کے پریشان و پشیمان ہو۔ بظاہر اس کی آنکھیں قماربازوں کے سر پر ٹکی ہوئی تھیں یا پتوں پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر دراصل وہ نیم خفتہ و نیم بیدار حالت میں تھا۔ اسے مس میگی کا گھر دکھائی دیا۔ مس میگی شروع شروع میں ایک یوریشین سوسائٹی گرل تھی اور ایک بڑے بلند مرتبت خاندان کی چشم و چراغ۔ اسے پنٹنگ (PUNTING) کی لت پڑ گئی۔ بک میکرز نے اسے خوب لوٹا۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے آپ کو بیچنے لگی اور اب اس کے ہاں امیر آدمیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔

تصور میں جلال نے اپنے آپ کو میگی کے دروازے پر کھڑا پایا۔ اسے دیکھتے ہی وہ دوڑی دوڑی اسے لینے کے لئے دروازے تک آئی۔ کیونکہ جلال مس میگی کا مستقل یا لاڈلا قدردان

گاہک تھا۔ میگی نے اسی انداز سے جو شکایت سے بھی نہ تھی۔ پوچھا:

"تم گذشتہ دو شب کہاں رہے جلال؟.... تمہاری طبیعت مضمحل نظر آتی ہے کچھ؟"

ایک اور سروقد بت تھا جو کہ میگی کے مقابل آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بت قدرے دھندلا سا دکھائی دیتا تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ اس بت کے منہ میں زبان نہیں ہے۔ مگر پھر بھی کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یکایک اس بت نے بھی وہی الفاظ دہرا دیئے۔ وہ بت جلال کی بھولی بسری بیوی تھی۔ جلال نے اپنی بیوی اور مس میگی کے استفسار کا مقابلہ کیا۔ بیوی اسے اسی کے لئے چاہتی تھی۔ اور کبھی کبھی شکایت کے آنسو گراتے ہوئے پوچھتی — "میں کہتی ہوں.... آپ دو رات کہاں رہے۔ میں یہاں اکیلی تڑپتی رہی ہوں" اور وہ آواز مطلق تصنع اور ناز و انداز کی حامل نہ تھی۔ بلکہ دل ہی سے دماغ سے مشورہ لئے بغیر اس کے خیالات لبوں تک آ جاتے۔ لیکن میگی، جلال کو جلال کے لئے نہیں، اس کی جیب کے لئے چاہتی تھی جو کبھی نہیں بلکہ ہمیشہ معمور رہتی تھی۔

"فیراڈوے...... اس دفعہ پھر ہار گیا جلال —— فیراڈوے ہار گیا" میگی نے جلال کو تاسف سے بھری ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اسے ہارنا ہی چاہئے...." جلال نے جواب دیا اور پھر بولا "میرے عزیز چچا حبیب احمد کل فوت ہو گئے ہیں...." اس وقت اس کی رحم طلب نگاہیں وہاں بیٹھے ہوئے دو ایک آدمیوں کی طرف اٹھ گئیں۔ تمام نے افسوس اور ہمدردی کا اظہار کیا۔ ان میں سے ایک نے یہ بھی محسوس کیا کہ جلال نے عیش و نشاط کے موقع پر یہاں آ کر اپنی افسردہ دلی سے تمام انجمن کو افسردہ کر کے اپنی کم فہمی کا ثبوت دیا ہے۔

میگی نے کئی ایک باتوں سے جلال کو تسلی دینی شروع کی۔ اور یہ بھی کہا کہ اس کے نہ آنے سے

کتنی بجلیاں تھیں جو اس پر کوندیں۔ اور کتنے وسوسے تھے جو اس کے دل میں آئے...

جوں جوں وہ یوریشین لڑکی خوشامد کرتی توں توں جلال کا دل اس سے متنفر ہوتا۔۔۔ اس نے ایک ہاتھ اپنی جیب پر رکھ لیا۔ جس کو بچانے کا صرف آج کے لئے ہی نہیں۔ بلکہ ہمیشہ کے لئے اس نے تہیہ کر لیا تھا۔ میگی کے پیش کردہ ہاتھ کو پرے دھکیلتے ہوئے ایک روکھی پھیکی مسکراہٹ سے جلال نے کہا: "تمہیں ایک خبر سناؤں میگی...... چچا اپنی جائداد کا ایک بڑا حصہ میرے نام چھوڑ گئے ہیں؟"

"سچ؟" میگی نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔ یہ بات صحیح معنوں میں اس کے لئے دلخوش کن اور دلنواز تھی۔ وہ اپنی خوشی کو فریب نظر کے دامن میں مستور نہ کر سکی۔ اگرچہ یہ اس کے پیشے کی خصوصیت ہوتی ہے اور وہ چھپاتی بھی کیسے؟ جب کہ جلال کی نظر نہایت باریک بیں ہو گئی تھی۔ اور اس وقت وہ فولاد کے آر پار بھی دیکھ سکتی تھی۔

"علاوہ اور چیزوں کے چچا مجھے ایک لاٹھی دے گئے ہیں۔۔۔ تاکہ میں ٹٹول ٹٹول کر اپنا راستہ بناؤں اور نشیب و فراز میں نہ گروں۔" جلال نے اپنے آپ کو کستے ہوئے بتایا۔

"کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو جلال...... کیا پی کے بے نیاز ہو جاؤ گے۔" میگی نے سمجھا کہ یہ صرف چچا کی موت کا گہرا اثر ہے۔ جلال نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"تمہارا شباب زوروں پر ہے......"

میگی نے اپنے جسم پر ایک چھلکتی ہوئی نگاہ ڈالی اور مسکرائی۔

"کل ڈھل جائے گا۔"

مس میگی نے دوسری دفعہ اپنے جسم کی طرف دیکھا اور خون اس کے رخساروں اور کانوں کی طرف دوڑنے لگا۔

"تم بوڑھی ہو جاؤ گی اور پھر تمہیں کوئی نہ پوچھے گا۔۔۔۔۔۔ یہ جتنے بھی بیٹھے ہیں، اور میں خود بھی ——" اس نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا" تمہارے شباب کے خریدار ہیں۔ جوانی کی شام ہونے پر یہ سب لوگ اپنے اپنے گھروندوں میں جا گھسیں گے۔ تم کو کوئی نہ پوچھے گا۔ پھر تم کیا کرو گی میگی؟"

"یہ سوال تو میں عنقریب ہی تم سے کرتی۔۔۔۔۔ کیا تم اس وقت میری خبرگیری نہ کرو گے؟"

"ایسا نہیں ہوا کرتا میگی، شباب کی رعنائیوں کے خریدار عمر کے ساتھ بوڑھی ہونے والی رعنائیوں کی کھوٹے داموں بھی قیمت ادا نہیں کرتے۔ اگر تم پینٹنگ میں تباہ ہونے کے فوراً بعد ہی شوہر کر لیتیں تو گو زندگی ظاہرا طور پر عیش سے نہ گزرتی تب بھی تمہارا انجام خراب نہ ہوتا۔ عورت سے وابستہ وہ آدمی جسے شوہر کہتے ہیں، اپنے بڑھاپے میں معمر بیوی کی بوڑھی اور بھونڈی رعنائیوں کی بھی وہی قیمت ادا کرتا ہے جو اس نے جوانی میں ادا کی ہوگی —— بلکہ اس سے بھی زیادہ —— میں نے تمہارے شباب کو عزیز کیا ہے اور اس کے لطف کو خریدا ہے۔ مگر بیوی نے بغیر دام لئے اپنے جام خلوص اور ایثار سے مجھے پلا دیئے۔ اس لئے وہی ایک ہستی ہے جو میرے جذبۂ ایثار پر تسلط جمانے کا حق رکھتی ہے۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ میگی! تم اس اندھے کی مانند ہو جو کہ بے تحاشا بھاگا جا رہا ہو۔ حالانکہ اس کے پاس لاٹھی بھی نہیں۔ تم نے اپنی لاٹھی یہیں کہیں گھر کے کسی کونے میں بھول کر ڈال دی ہے۔ اٹھو اسے ڈھونڈ نکالو اور اس سے اپنے مستقبل میں اپنی راہ نشیب و فراز اور کیچڑ سے بچ کر نکال لو ورنہ رنج والم کی گہرائیوں میں جا گرو گی ——"

جلال کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے آخری الفاظ نہایت زور سے کہے تھے۔ قمارخانے کے سب آدمی جلال کی طرف گھور رہے تھے۔ جلال کچھ گھبرا سا گیا۔ اس نے ویسے ہی اونچی آواز

میں کہا:

"یہ میرے ادیب چچا کے آخری الفاظ ہیں اور تم سب لاٹھی کے بغیر ہو۔ جو بالضرور مصائب کی خندق میں اوندھے منہ گرو گے ــــ"

ــــــ دوسرے لمحہ میں ہلال پگوڈ؛ نقار خانے کی پینتالیس سیڑھیوں کو بے تحاشا پھلانگتا ہوا جا رہا تھا اور اسے اپنے پیچھے بے تحاشا' دیوانہ وار قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

موت کا راز

اس بار بجائے ناہموار زمین کے شمال کی طرف نباتاتی ٹیلوں کے دامن میں، میں نے گندم کی بیسویں فصل لگائی تھی اور سرطانی سورج کی حیات گستر تمازت میں پکتی ہوئی بالیوں کو دیکھ کر میں خوش ہو رہا تھا۔ گندم کا ایک ایک دانہ پہاڑی دیمک کے برابر تھا۔ ایک خوشے کو مسل کر میں نے ایک دانہ نکالا۔ وہ کناروں کی طرف سے باہر کو قدرے جھکا ہوا تھا۔ اس کی درمیانی لکیر کچھ گہری تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ گندم اچھی ہے۔ اس میں خوردنی مادہ زیادہ ہے اور غلے کی منڈی میں اس سال اس کی فروخت نفع بخش ہوگی۔

میرے خیالات کچھ یکسوئی اختیار کر رہے تھے۔ اس وقت زندوں میں سے میرے نزدیک کوئی نہ تھا۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اگر زندوں میں سے کوئی تمہارے نزدیک نہ تھا تو کیا مُردوں کی یاد تمہارے ویران خانۂ دل کو آباد کر رہی تھی؟ —— میرا جواب اثبات میں ہے۔

میں آپ سے ایک اور بات بھی اصرار سے منوانا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ میں مُردوں کا تصور ہی نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ ان کو اپنے سامنے، پیچھے، دائیں اور بائیں کتھا کلی انداز سے رقص کرتے، ہنستے اور خوف سے کانپتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جس طرح آپ کی داڑھی کا بال بال مجھے علیحدہ نظر آتا ہے۔ اور آپ کی تمازت زدہ آنکھوں کے سُرخ ڈورے دیکھ رہا ہوں اسی طرح میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے کسی کا چہرہ جوہی موتیا کی اس کلی کی مانند جس کا چہرہ صبح کے وقت کاشمیری بہار کی شبنم نے دھو دیا ہو، شگفتہ ہو کر چمک رہا تھا اور کسی کے چہرے پر جھُریاں اور گہری گہری لکیریں تھیں۔ شاید وہ کسی نتیجہ خیز تجربۂ زندگی کی نشانیاں تھیں۔

نہ وہ گندم کے کھیت کے کناروں پر کھیل رہے تھے، نہ ہی بتیس سالہ شیشم جس کے گھنے سایہ دار پھیلاؤ کے نیچے میں آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا ...... اپنے ہلکے ہلکے پاؤں کر نچا رہے تھے۔ بلکہ وہ خود میرے جسم کے اندر تھے .... ہائیں! آپ حیران کیوں کھڑے ہیں۔ آپ پوچھتے ہیں کہ میں کہاں تھا؟ .... سنئے تو ...... میں جسم کی اس حالت میں تھا جسے انہماک کی آخری منزل کہنا چاہئیے۔ میں خود اپنے جسم سے علیحدہ ہو کر اسے یوں دیکھ رہا تھا جس طرح پرانی حکایتوں کا شہزادہ، کسی اونچے اور نباتاتی ٹیلے پر کھڑا دور سے اس شہزادی کے محل کا اُٹھتے ہوئے دھوئیں کے وجود سے اندازہ لگائے جس نے اپنی شادی مشروط رکھی ہو۔

وہ رقصاں، خنداں، لرزاں لوگ میرے بزرگ تھے .... بچہ اپنے والدین کی تصویر ہوتا ہے، میرا باپ اپنے باپ کی تصویر تھا۔ اس لئے میں اپنے دادا کی تصویر بھی ہو سکتا ہوں۔ اور یوں ارتقائی منازل طے کرنے کی وجہ سے اپنے بزرگانِ سلف کی اگر صاف نہیں

تو دھندلی سی تصویر ضرور ہوں...... ہندوستانی تہذیب دو نسلوں سے شروع ہے ایک دراوڑ اور دوسری آریہ۔ میں آریہ نسل سے ہوں، میرا دراز قد، سفید رنگ، سیاہ چشم، ہنستا کھیلتا خوش باش اور قدرے وہم پرست ہونا، اس بات کا ثبوت ہے ــــــــ یہ بات معلوم کرنے کی میری زبردست خواہش تھی کہ موت کا راز کیا ہے۔ مرتے وقت مرنے والے پر کیا کیا عمل ظہور پذیر ہوتا ہے۔ مجھے یہ یقین دلایا جا چکا تھا کہ مادہ اور روح لافانی ہیں۔ ایسی حالت میں اگر وہ موت کے عمل میں اپنی ہیئت بدلتے ہیں تو اس وقت ان کی کیا حالت ہوتی ہے ــــــــ آخر مرنے والے گئے کہاں؟ وہ جا بھی کہاں سکتے ہیں۔ سوائے اس بات کے کہ وہ کوئی دوسری شکل اختیار کر لیں، جسے ہم لوگ آواگون کہتے ہیں۔ کیونکہ مختلف ہیئات میں ظہور پذیر ہونے کے بعد پھر اس ذرہ کو جس سے ہم پیدا ہوئے ہیں، آدمی کی شکل دی جاتی ہے۔

یہ بات سن کر شاید آپ بہت ہی متعجب ہوں گے کہ میں اپنے سامنے اپنی پیدا ہونے والی اولاد کو بھی دیکھ رہا تھا۔ میرے سامنے ایک گھنگھریالے سیاہ بالوں اور چمکتے ہوئے دانتوں والا لحیم وشحیم بچہ آیا جو آج سے ہزاروں سال بعد پیدا ہوگا اور جو میری ایک دھندلی سی تصویر تھا، میں نے اسے گود میں اٹھا لیا اور چھاتی سے لگا، بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگا۔ اسے پیار کرتے وقت مجھے فقط یہی محسوس ہوا جیسے میں اپنا دایاں ہاتھ بائیں کندھے اور بایاں ہاتھ دائیں کندھے پر رکھ کر اپنے آپ کو بھینچ رہا ہوں۔ اس بچے نے کہا:

"بڑے بابا..... پرنام..... میں جا رہا ہوں۔"

میرا ہونے والا بچہ، اور بزرگان سلف تمام واپس جا رہے تھے۔ اس انہماک کے عالم میں، میں ابھی تک دور کھڑا یہی محسوس کر رہا تھا کہ میرا جسم زمین کا ایک ایسا حصہ

ہے۔ جس میں میرے بزرگانِ سلف کی غذائیں اور آئندہ نسلوں کے شاندار محل ہیں جن میں برسوں کے مردے اور نئے آنے والے اپنے قدیم اور جدید طریقوں سے جوق در جوق داخل ہو رہے ہیں۔

...... گھبرائیے نہیں، اور سُنئے تو ...... یہ میری باتیں جو بظاہر پاگلوں کی سی دکھائی دیتی ہیں، دراصل ہیں بڑی معنٰی خیز ...... مجھے کچھ سمجھا لینے دو ——— پھر میں آپ کو ادبی مضمون میں تشبیہہ دینے کا طریقہ بتاؤں گا۔ کل ہی آپ کہہ رہے تھے کہ درختوں پر گدھ شام کے وقت بیٹھے یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے کسی اونچے شیشم پر پھوٹی تربوز اوندھے لٹک رہے ہوں ——— کتنی بھونڈی تشبیہہ کہی آپ نے! ......

یہ تو میں جانتا ہی تھا کہ رُوح کے علاوہ مادہ بھی فنا نہیں ہوتا۔ مگر اس بات کو دیکھنے کی ایک آگ سی ہر وقت سینہ میں سُلگتی رہتی تھی کہ موت کے عالم میں، بظاہر فنا ہوتے ہوئے شخص یعنی ذرے کی مجموعی صورت کو کن کن تخریبی و تعمیری مدارج سے گذر کر دوسری ہیئت میں آنا پڑتا ہے ...... یعنی ...... آخر ...... موت کا راز کیا ہے؟

وہ ذرہ عظیم، وہ جزوِ لا یتجزی، جو کہ تمام ارضی و سماوی طاقت کا مغز ہے، کیسا منظم ہے۔ مثال کے طور پر اجرامِ فلکی کی گردش کا نظام لیجئے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی جرم اپنے مخصوص راستہ سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہٹ جائے تو کیسی قیامت بپا ہو۔ چاند گرہن کے موقع پر ہم لوگ دان پُن بھی کرتے ہیں تو اسی لئے کہ وہی ایک ایسا وقت ہو سکتا ہے جبکہ اجرامِ فلکی کا کششِ ثقل سے اِدھر اُدھر ہو کر اور آپس میں ٹکرا کر مادہ ہیولیٰ کی شکل اختیار کر لینا ممکن ہے۔ ہم آریہ ——— حساس، منموجی اور توہم پرست لوگ یہ نہیں چاہتے کہ ہم کوئی بُرا کام کرتے ہوئے تباہ ہو جائیں۔ اور وہ مادہ ہیولیٰ کا ایک حصہ بن جائیں دان پُن

سے اچھا کام اور کیا ہوگا؟

.......آپ اسے تصوف، وہم اور خشک اور ترش مضمون کہیں۔ مگر یہ ان ہر اقسام سے بالاتر ہے۔ ہاں ہاں! آپ نے پوچھا تھا کہ ذرۂ عظیم کیا ہے ——— یہ جاندار شے کی ابتدائی صورت ہے۔ یہ عورت اور مرد دونوں میں زندہ ہے۔ تمام ارضی و سماوی طاقت کا مرکز ہے۔ شاید اس سے بہتر اس کی کوئی تعریف نہیں کر سکتا۔ اس کے متعلق میں ایک قیاس غیر مصدق جو بظاہر یاوہ گوئی دکھائی دیتا ہے، مگر ہے بہت جامع اور درست — دہرا دینا چاہتا ہوں۔ وہ قیاس غیر مصدق ریاضی طبیعیات کے ایک بڑے ماہر[1] نے کہا تھا:

"ذرہ...... بجز و لاتیجزی...... ہم نہیں جانتے کیا...... کیا کچھ کرتا ہے ——— ہم نہیں جانتے کیسے!......؟......!!"

شاید ریاضی والوں نے ریاضی قواعد ضرب و تقسیم اس ذرے سے ہی سیکھے ہیں۔ وہ دو سے چار، چار سے آٹھ اور آٹھ سے چوگنا ہو جاتا ہے...... اور پھر ہزاروں سے حیران کن طور پر ایک.......... یہ تو سب جانتے ہیں کہ وہ یہ سے وہ ہو جاتا ہے مگر اس بات سے پردۂ راز نہیں اٹھا، کہ وہ کیسے؟ جس دن یہ پردۂ راز اُٹھے گا تو موت کا راز منکشف ہونے میں باقی رہ ہی کیا جائے گا؟

چند دن ہوئے میں اسی اضطراب ذہنی میں مبتلا بیٹھا تھا اور سرطانی سورج گندم کی بالیوں کو پکا رہا تھا۔ بالیاں بالکل سوکھ چکی تھیں اور ان کے دانے بھی اس قدر خشک ہو گئی تھی کہ ایک ایک

(1 Eddington — In his Gifford Lectures)

بال کانٹے کی مانند چبھتا تھا، کچھ دبانے سے بال خود بخود جھڑنے لگتے۔ بٹے کو مسلتے مسلتے اس کا ایک بال میرے ناخن میں اُتر گیا اور لاکھوں ذرات جن کی میں مجموعی صورت ہوں۔ ان میں سے ایک ذرے کو جو کہ انفرادی طور پر ذرّہ عظیم سے کم نہیں، اس نے آگے دھکیل دیا، وہ ذرہ جو آگے دھکیلا گیا نامعلوم گذشتہ زمانے میں میرا کوئی بزرگ تھا، یا شاید آئندہ نسلوں میں سے کوئی ——— یہ میں جان نہ سکا، بہرحال بٹے کا بال ان دونوں میں سے نہ تھا، وہ ایک بیرونی خارجی چیز تھی جس کو میرے نظام جسم میں چلے آنا اس مسافر کی مداخلت بے جا کی مانند تھا، جو لفظ "شارع عام نہیں ہے" پڑھتے ہوئے بھی اندر گھس آئے۔ یہ قطعی ممانعت کی وجہ ہی تھی کہ درد کی ٹیس اٹھ اٹھ کر مجھے لرزہ براندام کر رہی تھی ———

بھلا ایک کتا اپنی گلی میں دوسرے کتے کو نہیں آنے دیتا، تو میرے قابل پرستش بزرگوں اور معرکۃ الآرا کام کرنے والی آئندہ نسلوں کی عظیم الشان ہستیاں اس خارجی چیز کی مداخلت بے جا کو کب برداشت کر سکتی تھیں۔ اُف درد! ماسوا اس چیز کے ——— بجز اس ذرے کے جو کہ ہماری آئندہ نسلوں کا اپنی ضرب و تقسیم کے ساتھ روحانی اور جسمانی بنے، یا ہمارے بزرگوں سے ہمیں ورثہ میں آئے۔ کسی اور چیز کو مطلق دخل نہیں۔ مادہ اور روح دونوں اس وقت تک چین نہیں پاتے جب تک خارجی مادے کو ہر ایک تکلیف سہہ کر جسم سے باہر نہیں پھینک دیا جاتا۔

وہ ذرہ تو ہر جنبش سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ اگر آپ نے غلط روی سے اپنے جسم و روح کے نامناسب استعمال سے انہیں کسی طرح مفلوک اور ناتواں بنا دیا ہے تو آپ کے وہ ذرے جنہوں نے آپ کے بیٹے اور پوتے بننا ہے۔ مفلوک اور ناتواں حالت میں آپ کے سامنے آکر آپ کے دلی اور ذہنی اضطراب کا باعث ہوں گے۔ وہ اسے قسمت و تقدیر

کہیں گے۔ لیکن اگر قسمت کی تعریف مجھ سے پوچھیں تو وہ یہ ہے۔ محبت و نیک و بد کے اثر کے علاوہ جو چیز پوری ذمہ داری سے ہمارے بزرگوں نے ہمیں دی ہے وہ ہماری قسمت ہے۔" اس لئے آپ جو بھی فعل کریں، سوچ کر کریں۔ انگلی بھی ہلائیں تو سوچ کر...... یاد رکھئے۔ یہ ایک معمولی بات نہیں ہے...... اب شاید آپ ذرّے کے قول و فعل سے کچھ واقف ہو گئے ہوں گے۔

جس دن بیٹے کا بال میرے ناخن میں داخل ہوا۔ میں بہت مضطرب رہا۔۔۔۔۔ شام کو میں گھبرایا ہوا قریب ہی شہر کے ایک بڑے اختر شناس کے پاس گیا۔ اس نے میری راس وغیرہ دیکھتے ہوئے قیافہ لگایا اور مجھے کہا کہ برہسپت کا اثر تمہیں ہر بلا سے محفوظ رکھے گا اور تمہاری عمر بہت لمبی ہے۔ اس کا شاید خیال ہو کہ درازیٔ عمر کی پیشین گوئی سُن کر یہ مالدار زمیندار اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی میں چمکتی ہوئی طلائی انگوٹھی اتار کر دے گا۔ مگر یہ بات سن کر مجھے سخت بے چینی ہوئی۔ مایوسی کے عالم میں میں نے اسے اس کی قلیل فیس ۔۔۔۔ ایک ناریل، آٹا اور پانچ پیسے دے دئے...... میں تو مرنا چاہتا تھا اور دیکھنا چاہتا تھا کہ اس حالت میں مجھ پر کیا عمل ہوتا ہے۔ مجھے اس بات کا بھی شوق تھا کہ میں اس راز کو، جس کی بابت بڑے بڑے حکیم اور طبعیات کے ماہر کہہ چکے ہیں ۔۔۔۔ "وہ کرتا ہے کچھ...... ہم نہیں جانتے کیسے......" طشت ازبام کر دوں، اور دنیا میں پہلا شخص بنوں جو کہ دوسری ہیئت میں آتے ہوئے اپنی حیرت انگیز یادداشت کے ذریعہ سے دنیا پر واضح کر دے کہ ذرّے کو یہ حالت پیش آتی ہے ۔۔۔۔ اور وہ اس شکل میں تبدیل ہوتا ہے۔

اس بات کے مشاہدہ کے لیئے خود مرنا لازمی تھا مگر عاقل اختر شناس نے اس کے برعکس درازیٔ عمر کی رُوح فرسا خبر سُنائی تھی' آتم گھات' خودکشی ایک پاپ تھا' جس کا ارتکاب نہ صرف میرے بزرگوں کے نام پر دھبہ لگاتا تھا' بلکہ موجودہ بچوں اور آئندہ نسلوں پر بھی اثر انداز ہوتا تھا' چنانچہ میں نے خودکشی کے خیال کو بالکل باطل گردانا۔

میں جنگل میں ایک ٹیلے پر بیٹھا تھا' وہاں سے دریائے گنڈک کے کسی معاون کے ایک آبشار کی آواز صاف طور پر کانوں میں آ رہی تھی اور چونکہ مجھے وہی بات خوش کر سکتی تھی جو کہ میرے دل کو مضطرب کرے۔ اس لیئے گنڈک کے معاون کے آبشار کی دل کو بٹھا دینے والی آواز مجھے بھا رہی تھی' ایک پتھر کو الٹاتے ہوئے میں نے بہت سے کیڑے مکوڑے دیکھے۔ پھر میں نے کہا:

"شاید اس آبشار کی آواز اور موت کے راگ میں کچھ مشابہت ہو ——" شام ہو چکی تھی' سورج مکمل طور پر ڈوبا بھی نہیں تھا۔ کہ سر پہ چاند کا بے نور اور کاغذی رنگ کا جسم دکھائی دینے لگا۔ پتھروں میں سے ایک جلا دینے والی بھڑاس نکل رہی تھی۔ یکایک مجھے ایک خیال آیا' ایک ترکیب سوجھی۔ جس سے میں ذرے کی ہیئت بدلنے کا مشاہدہ کر سکتا تھا۔ یعنی موت کا عمل بھانپ سکتا تھا۔ اسے ہم خودکشی بھی نہیں کہہ سکتے۔ وہ صرف مشاہدہ کی آخری منزل ہے۔ وہ یہ —— کہ گنڈک کے معاون کے آبشار سے آدھ میل بہاؤ کی طرف جہاں پانی کی خوفناک لہریں ایک پتھریلے ٹیلے کو عمودا ٹکرا کر اور مڑتے ہوئے جنوب مشرق کی طرف گنڈک سے ملنے کے لئے نکلتی ہیں' نہانے کے لئے اتر جاؤں اور غیرارادی طور پر پانی کے اندر ہی اندر گہرائی اور تیز بہاؤ کی طرف آہستہ آہستہ چلتا جاؤں اور یہ صورت پیدا ہو کہ یا میرا پاؤں کسی آبی جھاڑی میں اڑ جائے یا کوئی جانور مجھے کھینچ لے یا پانی کا کوئی

زبردست ریلا وہ عمل میرے سامنے لے آئے جس سے کہ کوئی دوسری صورت ملے ——— شاید آپ اسے بھی خودکشی کہیں۔ مگر اس غیرارادی عمل کو میں تو قدرتی موت کہوں گا۔

چنانچہ مرنے سے بہت پہلے میں نے اپنے تصور میں گنگعل ——— گنگا مائی کے چرنوں پر سر رکھا اور سوگندلی کہ میں ضرور اس غیرارادی فعل کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں گا۔

گنڈک کی معاون آبشار سے ایک میل بہاؤ کی طرف بھی پانی اسی تیز رفتاری سے بہ رہا تھا باوجودیکہ عموماً چٹان سے ٹکراتے ہوئے اس کی لہریں اپنا دم توڑ چکی تھیں۔

میں کمر تک ننگا تھا اور دھولا گری کے اردگرد کی پہاڑیوں سے آئے ہوئے برفانی پانی میں داخل ہو چکا تھا۔ میں جلدی جلدی آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ ایسا کرنا ارادتاً اپنے آپ کو مار ڈالنا تھا۔ کچھ آگے بڑھتے ہوئے میں نے آہستہ آہستہ پاؤں کو اقلیدسی نصف دائرہ کی شکل میں گھمانا شروع کیا اور تقریباً پانچ منٹ تک ایسا کرتا رہا تاکہ پانی کا کوئی ریلا مجھے بہا لے جائے۔ یا کوئی تیندوا یا گھڑیال پانی میں ٹانگ پکڑ کر مجھے گھسیٹ لے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔

...... معاً میرا پاؤں ایک آبی جھاڑی میں الجھ گیا اور میں پانی میں غوطے کھانے لگا۔ میرا پاؤں پھسلا اور دوسرے لمحہ میں پانی کے ریلے بڑے زور شور سے میرے سر سے گذر رہے تھے۔

کچھ دیر تک تو میں نے اپنا دم سادھے رکھا۔ مگر کب تک؟ بے ہوش ہونے سے پہلے

مجھے چند ایک باتیں یاد تھیں کہ میری ٹانگیں اور ہاتھ تیز پانی میں کانپتے ہوئے ادھر ادھر چل رہے تھے۔ باہر نکلتے ہوئے سانس سے چند بلبلے اٹھ کر سطح کی طرف گئے۔ میرے دماغ میں زندہ رہنے کی ایک زبردست خواہش نے اکساہٹ پیدا کی۔ اس کوشش میں میں کسی چیز کو پکڑنے کے لئے پانی میں ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ مگر اب میں پانی کی زد سے باہر نہ آسکتا تھا۔ اگرچہ میں نے اس کے لئے بہت کچھ جدوجہد کی۔

اس کے بعد میری یادداشت مختل ہونے لگی .... میرے بزرگان .... کنکھل .... پرانی حکایتوں کا شہزادہ .... موت کا راز .... مکتی ناتھ .... کنکھل .... موت کا راز .... اس کے بعد ایک نیلا سا اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرے میں کبھی کبھی روشنی کی ایک جھلک ایک بڑے سے کیڑے کی شکل میں دکھائی دیتی .... پھر پرانی حکایتوں کا شہزادہ .... ذرہ .... موت کا عمل .....

خاموشی اور اندھیرا ہی اندھیرا!

اس مکمل بے ہوشی میں، مجھے ایک نقطہ سا دکھائی دیا جو کہ برابر پھیلتا گیا۔ شاید یہ وہی ذرۂ عظیم تھا جس کی بابت میں نے بہت کچھ کہا ہے جو بسیط ہوتا گیا۔ وہ پھیل کر ایک جھلی کی سی صورت میں میرے جسم کے ارد گرد لپٹ گیا۔ اس طرح کہ اب پانی اس میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی خلا میں ہوں۔ جہاں سانس لینا بھی ایک تکلف ہے۔

ذرۂ عظیم سے آواز آنے لگی:

"موت کے عمل میں تین حالتیں ہوتی ہیں قبل از موت، موت، بعد از موت۔ اول حالت میں ہو سکتا ہے کہ دوسری حالت تم پر طاری ہونے سے پہلے تم زندہ رہ جاؤ۔ قدرتاً اس میں

تمہیں دوسری حالت کا احساس نہیں ہو سکتا۔ دوسری حالت میں تم اس بات کو ایک عارضی عرصہ کے لئے جان سکتے ہو جس کی تم اتنی خواہش لئے ہوئے ہو۔ مگر اس کا اظہار نہیں کر سکتے مابعد موت تمہیں زندگی کی پہلی نشانی گویائی قوت عطا کی جاتی ہے۔ پھر یادداشت کو جو اوّل دوم حالت میں تمہارے ساتھ ہوتی ہے۔ اسے خیر باد کہنا ہوتا ہے۔ ذرّے کو فراموشی عطا کر کے اس پر مہربانی کی جاتی ہے۔ عین اسی طرح جیسے آدمی کو غیب سے ناآشنا کر کے اس پر کرم کیا جاتا ہے ——— وہ راز یادداشت کی مکمل تحلیل میں پنہاں ہے۔"

"یادداشت کی مکمل تحلیل" میں نے ان الفاظ کو ذہن میں دہراتے ہوئے کہا۔ "یادداشت کی تحلیل ——— کیا ہماری نسلیں بھی ہماری یادداشت ہیں؟ ...... اور کیا اس کی مکمل تحلیل پر میں وہ راز دنیا والوں کے سامنے طشت ازبام کر سکتا ہوں؟ ...... میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔" ——— زندگی کی اس خواہش کے ساتھ ہی میں نے اپنے آپ کو مکتی ناتھ اور دھولاگری کے ارد گرد کی پہاڑیوں میں سے بہ کر آتے ہوئے برفانی پانی کی سطح پر پایا۔ جھلّی سی میرے جسم پر سے اتر چکی تھی۔ زندگی کی ایک اور خواہش کے پیدا ہوتے ہی گنڈک کے معاون کے ایک ریلے نے مجھے کنارے پر پھینک دیا۔ اس وقت چاندنی رات میں ہوا تیزی سے چل کر سانس کی صورت میں میرے ایک ایک مسام میں داخل ہو رہی تھی۔

راجندر سنگھ بیدی

فن اور نقطۂ نظر کے اعتبار سے ایک مکمل ادیب ہے۔ اس کے افسانے وہ ادبی نقوش ہیں جن میں سماج کی موجودہ ساخت کے خلاف بغاوت کی گئی ہے اور ان جڑوں کو کاٹا گیا ہے جو ہماری معاشرت اور انسانیت کے گرد لپٹی ہوئی ہیں۔

گرہن

بیدی کے ان افسانوں کا مجموعہ
جنہوں نے اس کے فن اور اد[illegible] پر [illegible] کی
مہریں ثبت کردی

نیا ادارہ : لا[illegible]

سویرا اد[illegible] [illegible]ہور